Regd.L.No.7243

Phone,80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1968

سچّے موتی

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں ۔

اس لئے

اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے ۔

(ابو داؤد)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ

عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوستے نہیں۔ یہ کتاب پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے، دوسری و تیسری جلد
(ہر جلد) پانچ روپے فی جلد

ایمان افروز کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی محض ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کلمات کا مادہ اور واضح معنی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس مفہوم کو پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ آئیڈیالوجی کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا نقطۂ نگاہ متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے میں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات و مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے)
پیپر ایڈیشن۔ چار روپے

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی۔ گلبرگ — لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے

سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے

سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستانی : ایک روپیہ

ہندوستانی

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵-بی - گلبرگ ۲ - لاہور

جلد (۲۱) مئی ۱۹۶۸ء نمبر (۵)

فہرست

۱۔ لمعات ـــ ۲

۲۔ ذاتی ملکیت ـ قرآن کی رو سے ـــ محترم پرویز صاحب ـــ ۹

۳۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی ـــ محترم عنایت اللہ صاحب ـــ ۲۳

۴۔ انڈونیشیا کا عالمی کردار ـــ محترم خورشید عالم صاحب ـــ ۳۱

۵۔ حقائق و عبر ـــ (جمہوریت یا مذاق) ـــ (حدیث کے پرکھنے کا معیار) ـــ (قربانی کیوں واجب ہے) ـــ (انصار کی تعلیم کا مسئلہ) ـــ ۳۸

۶۔ نقد و نظر ـــ (محشر فلسطین) ـــ (کلچر آف اسلام) ـــ (ماہنامہ المعارف) ـــ (نسخۂ شفا) ـــ ۴۳

۷۔ پرویز صاحب کا دورۂ لائل پور ـــ ۴۷

۸۔ منکرینِ حدیث کون ہیں؟ ـــ محترم ابوشہاب رفیع اللہ صاحب ـــ ۴۹

۹۔ مطالب القرآن ـــ ۶۵-۸۰

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں موسمِ بہار کی آمد کے ساتھ ہی، جب ہر شے میں حیاتِ نو کی نمود ہوتی ہے، تاریخِ پاکستان کے دو اہم واقعات کی یاد منانے کے دن آتے ہیں — ایک تیئیس مارچ، جب ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم نے اپنے دین کے تمکن کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے حصول کے عزم کا اظہار کیا۔ — اور دوسرا اکیس اپریل، جب قوم کو اس تصور کا عطا کرنے والا مردِ مومن، (اقبالؒ) اس جہانِ فانی سے عالمِ جاوداں کی طرف گامزن ہوگیا۔ ہر چند یہ دن اُس انداز سے نہیں منائے جا رہے جو اُن کے شایانِ شان ہے، بایں ہمہ غنیمت ہے کہ قوم نے انہیں بالکل فراموش نہیں کر دیا، ورنہ جو قوم اس طرح لوٹ میں مصروف ہو جائے اُسے "ایامِ اللہ" کی یاد قائم رکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔ لیکن جہاں یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ قوم نے ان دنوں کو بالکلیہ فراموش نہیں کیا، یہ حقیقت باعثِ صد تاسف ہے کہ اِن تقریبات کے سلسلے میں دانشورانِ ملت کی طرف سے بالعموم جن خیالات کا اظہار ہوتا ہے وہ اُن محرکات کو نگاہوں سے یکسر اوجھل کر دیتے ہیں جو مطالبہ اور حصولِ پاکستان کی اصل و بنیاد تھے، اور اُس پیام کو بُری طرح مسخ کر دیتے ہیں جسے اقبالؒ نے قوم کو دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس سے حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے بلکہ اُس کی بجائے ایسے تصورات ذہنوں میں بیدار ہو جاتے ہیں جو اُس حقیقت کے یکسر مخالف ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی تشکیل، رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک سے نہیں ہوتی بلکہ دین کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ دین ہی مسلمانوں کے لئے وجہِ جامعیت ہے جو انہیں وطن کی جغرافیائی حدود سے ماورا لے جا کر ایک عالمگیر برادری بنا دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک عرب کا بسنے والا عجمؒ اور

روم کا رہنے والا صہیبؓ دین کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے فرد ہوتے ہیں اور مکّے کے باشندے اور خون کے رشتے میں مشترک، ابوبکرؓ اور ابوجہل دو الگ الگ قوموں کے افراد ۔۔۔ یہ وہ فراموش کردہ حقیقت تھی جس کا دورِ حاضر میں سرسید نے سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں اعلان کیا اور اسی بنا پر اُن اصلاحات کی مخالفت کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم تصور کر کے ہندوستان میں نافذ کی جا رہی تھیں ۔۔۔ سرسید کے بعد اقبالؔ نے قرآن کی اس تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ اپنے مخصوص، حسین، بلیغ اور دلکش انداز میں ساری عمر اسے عام کرتا رہا۔ اُس نے ۱۹۰۵ء میں اعلان کیا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمارؐ نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اُس کے بعد اُس نے تشکیلِ قومیت کے مغربی (اور اُن کے اتباع میں ہندوانہ) تصور پر یہ کہہ کر بھرپور وار کیا کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور مسلمان سے کھلے الفاظ میں کہا کہ یہ ایک تازہ بت ہے اور

اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس لئے کہ ۔۔۔

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے !

انہوں نے مغربی فلسفۂ قومیت سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

وہ عمر بھر اس پیغام کو عام کرتے رہے اور پھر ۱۹۳۷ء میں اسی دو قومیتوں کے فلسفہ کی بنیاد پر مسلمانوں کیلئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ انہیں تشکیلِ قومیت سے متعلق قرآن کریم کے اس فلسفہ پر ایسا یقینِ محکم تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں لکھا۔

اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے دنیائے اسلام

میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتے کرتے ۱۹۳۸ء میں دنیا سے چلا گیا اور اس شمع کو اُس دیدہ ور کے ہاتھ میں دے گیا جسے وہ اس امانت کا بہترین امین سمجھتا تھا۔ اُس کے بعد قائداعظمؒ نے اسی بنیاد پر ہندو، انگریز اور نیشنلسٹ مسلمانوں سے مسلسل نو سال تک لڑائی لڑی[1] جس کے بعد انہیں قابلِ فخر کامیابی نصیب ہوئی اور دین کی بنیادوں پر متشکل مسلمانوں کی جداگانہ قوم کو، ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہو گیا تاکہ وہ اس میں اپنے تصورات کے مطابق اپنی مملکت قائم کر لیں۔

۲۳ مارچ اور ۲۱ اپریل کی یاد منانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ نظریۂ قومیت سے متعلق قرآن کی اس تعلیم کو، جسے اقبالؒ نے اس حسن و خوبی سے پیش کیا اور جس کی بنیادوں پر قائداعظمؒ نے ایسی معرکہ آرا لڑائی لڑی، قوم کے سامنے واضح انداز میں پیش کیا جاتا۔ یہی وہ طریق تھا جس سے اقبالؒ اور جناحؒ کی صحیح عظمت سامنے آسکتی تھی۔ لیکن یہاں ہو یہ رہا ہے کہ اس قرآنی نظریہ کو سامنے لانا تو ایک طرف، ایسے تصورات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے جو اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں اور اشتراکِ وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کو پاکستان کے نشاۃ کے عین مطابق قرار دے کر نئی نسل کو مقصودِ پاکستان سے منحرف کرنے میں مصروف ہیں۔ اس خیال کے عام کرنے میں لادینی عنصر ہی پیش پیش نہیں، خود دین کی اجارہ داری کے مدعی بھی اُن سے کسی صورت میں کم نہیں۔ جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کو (بقول اس جماعت کے) سب سے پہلے پیش کیا۔ اور اس طرح وہ حصولِ پاکستان کی تاریخ کے مستحکم رکن قرار پائے۔ مودودی صاحب نے وہاں کیا کیا تھا اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں اُن کا رول کیا تھا، یہ وہ حقیقت ہے جسے ان صفحات پر بار بار سامنے لایا جا چکا ہے اس لئے اس وقت اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ دو قومی نظریہ کے متعلق اب خود اُن کی پوزیشن کیا ہے۔ انہوں نے چوہدری محمد علی صاحب کے مدوّن کردہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے متعلق فرمایا تھا کہ اس کے نفاذ سے مملکتِ پاکستان مسلمان ہو گئی ہے۔ اُس آئین میں نہ صرف یہ کہ دین کی بنیادوں پر مسلمانانِ پاکستان کو غیر مسلموں سے الگ قوم قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ یہ

---

[1] اس لڑائی کی تفاصیل طلوعِ اسلام کے دورِ قبل از تقسیم کے فائلوں میں محفوظ ہیں۔

بھی نہیں کہا گیا تھا کہ یہاں جداگانہ انتخاب ہوں گے (۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی اسی پوزیشن کو برقرار رکھا گیا ہے) مودودی صاحب نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی اس شق کے خلاف نہ اس وقت کچھ کہا تھا اور نہ اب ہی اسکا کبھی ذکر کرتے ہیں۔ اب مودودی صاحب "جمہوریت" کی ایک شکل (یعنی پارلیمانی سسٹم) کو عین اسلام قرار دے کر مصروف جہاد ہیں۔ اس جمہوریت کے سلسلے میں بھی انہوں نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ جمہوریت صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کے برعکس انہوں نے سابقہ الیکشن کے دوران اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اُسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے کہ اُس نے یہ اصول تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (بحوالہ امروز ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

جب دین کی اجارہ داری کے مدعیان کی یہ کیفیت ہو تو (اُن کی اصطلاح میں) "لادین طبقہ" پر کیا گلہ ہو سکتا ہے؛ اقبالؒ کے الفاظ میں (ایک لفظ کے تغیر کے ساتھ)

اُنکو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی　　اس عہد کا مُلّا ہے کیوں ننگِ مسلمان

---

۲۳ مارچ اور ۲۱ اپریل کی یادگار منانے میں دوسری اہم حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ تشکیلِ پاکستان سے بنیادی مقصد کیا تھا۔ اس مقصد کو اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اُس وقت ہو چکا تھا جب کسی رسُول کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان، جمادات اور نباتات کی طرح پالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی) اسلئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

یہی وہ حقیقت تھی جسے قائداعظمؒ اپنی دس سالہ جد و جہد میں بار بار دُہراتے رہے۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۴۵ء میں فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا۔

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے

> جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اسلامی حکومت کے امتیازی تصور کو ایسے غیر مبہم الفاظ میں پیش کیا جن کے مفہوم میں دو آراء ہو نہیں سکتیں — انہوں نے فرمایا۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اسی حقیقت کو وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی دہراتے رہے۔ مثلاً انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے خالق دینا ہال، کراچی میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

ہم اس سلسلے میں طلوع اسلام میں اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ ان سے زیادہ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت اسلئے — اور صرف اسلئے تھی — کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام دین کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا، صرف مذہب رہ جاتا ہے اور مذہب اور دین دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ ہم نے پاکستان صرف اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہم اس میں اُس دین کا احیاء کر سکیں جس کا ضابطۂ حیات قرآن ہے اور جس کے مطابق حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقاء نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم فرمائی تھی۔

لیکن ۲۳ مارچ اور ۱۴ اپریل کی تقاریب کے سلسلے میں اس ضمن میں بھی بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں — اُن لوگوں کو تو چھوڑ یئے جو تحریکِ پاکستان کے شروع سے مخالف چلے آرہے تھے (اور اب بھی اُس مخالفت کے جراثیم اُن کے سینے میں کلبلاتے رہتے ہیں) وہ اربابِ دانش و بینش بھی جو تحریکِ پاکستان کے منتقدین میں سے تھے (اور ہیں) اُن کی طرف سے بھی اس قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں

کو بڑی اذیتیں پہنچائیں۔ ہندو بڑا تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کو انسانی حقوق تک دینے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا تھا کہ ہم اُن سے الگ ہو جاتے۔

گویا مطالبہ پاکستان کی کوئی مثبت بنیاد نہیں تھی۔ یہ محض مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کی تنگ نظری کا ردِعمل تھا۔ اگر ہندو تنگ نظر نہ ہوتا تو ہم اُن سے الگ ہونے کی خواہش کبھی نہ کرتے۔ اس دلیل کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر آج بھی ہندو اپنی تنگ نظری چھوڑ دے اور ہم سے کشادہ ظرفی سے پیش آنے کا عہد کر لے تو ہم اِس علیحدگی کے تصور کو ختم کر دیں ـــــ چیست یارانِ طریقت بعدازاں تدبیرِ ما۔

کسی حلقے کی طرف سے آواز آتی ہے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمان کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے ہمیں اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنی پڑی۔ یعنی (ان حضرات کی ذہنیت کے مطابق) تشکیلِ پاکستان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہماری اپنی بڑی بڑی فیکٹریاں نصب ہو جائیں، ہم بڑے بڑے جاگیردار بن جائیں۔ اس سے زیادہ اس تحریک اور مطالبہ کا مقصد کوئی نہ تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقتصادی خوشحالی قوموں کی زندگی کے لئے لابُدّی عنصر ہے لیکن مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ اقتصادی خوشحالی نہیں تھا۔ اس کا بنیادی جذبہ اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا قیام تھا جس کا لازمی نتیجہ اقتصادی خوشحالی بھی ہوتا ہے ـــــ وہ خوشحالی جس میں مملکت کا ہر فرد برابر کا شریک ہوتا ہے، نہ کہ وہ خوشحالی جو صرف ایک محدود طبقہ کا مقدر بن کر رہ جاتی ہے۔

جماعت اسلامی کی طرف سے بیشک یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک اقامتِ دین کے لئے حاصل کیا گیا تھا، لیکن اقامتِ دین سے ان کی مراد ہے تھیاکریسی ـــــ اور تھیاکریسی کی بھی وہ بھیانک ترین شکل جس میں مملکت کا اقتدار اعلیٰ "مزاجِ شناسِ رسولؐ" (یعنی امیرِ جماعت اسلامی) کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ جائے (تفصیل اس اجمال کی طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت کے لمعات میں گزر چکی ہے۔ دینی ریاست کا یہی وہ تصور ہے جس سے گھبرا کر بعض حساس قلوب یہاں تک کہنے لگ جاتے ہیں کہ اس سے تو بہتر ہے کہ یہاں سیکولر نظامِ حکومت قائم ہو جائے۔

بہرحال، یہ ہیں وہ خیالات جو (بالعموم) ۲۳ مارچ اور ۱۴ اپریل کی تقاریب کے سلسلہ میں فضا میں عام کئے جاتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ ان سے قوم کی نئی نسل کے قلب و دماغ پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ابھی ملک میں ایسے لوگ باقی ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں عملاً حصہ لیا۔ (اگرچہ وہ بیچارے اس طوفانِ بدتمیزی سے تنگ آ کر کونوں کھدروں میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں) یا جو اس کے عینی شاہد ہیں۔ جب یہ بھی دنیا سے رخصت ہو جائینگے تو پھر ہماری آنے والی نسلوں کو کوئی اتنا بتانے والا بھی نہیں رہے گا کہ

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا

اس لئے کہ اس وقت تک (قوم کا لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ صرف ہو جانے کے باوجود) تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی تاریخ بھی شائع نہیں ہوتی جسے اس کے صحیح (دینی) پس منظر کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو۔ اور یہ مرتب بھی کیسے ہو؟ اربابِ اقتدار و اصحابِ سیاست کو اپنی اپنی بساط کی مہرہ بازیوں سے فرصت نہیں۔ "دانشورانِ ملت" ہر وقت یہ مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں کہ ملک کی لوٹ میں انہیں برابر کا حصہ نہیں ملا (ہمارے دور کا تنقیدی ادب سب اسی شکوۂ تقدیر کا آئینہ دار ہے) اربابِ ثروت حصولِ دولت کی ریس (RACE) میں پاگل ہو رہے ہیں۔ مُلّا اس جہادِ عظیم میں مصروف ہے کہ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے اس کی زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں دی جانی چاہیئے۔ ان حالات میں ان فراموش کردہ حقیقتوں کو کون سامنے لائے جو حصولِ پاکستان کی محرک تھیں۔

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے؟

یوں ہمارے ہاں ۲۳ مارچ اور ۲۱ اپریل کی تقاریب رسمی طور پر منائی جا رہی ہیں۔۔۔ اور نظر تو یوں آتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ رسمیات بھی گلدستۂ طاقِ نسیاں بن کر رہ جائیں گی۔ جن رسوم کی اصل و بنیاد کی تحقیق سے ملوکیت، رہبانیت اور قارونیت کے چہرے بے نقاب ہونے کا ڈر ہو انہیں باقی رکھنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے نظر یہی آتا ہے کہ کچھ وقت کے بعد ان تقاریب کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ملیگا اور اگر کوئی سرپھرے ایسے ملینگے تو انہیں یہ کہکر مرفوع القلم قرار دے دیا جائے گا کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

لیکن اس کے باوجود ہم مایوس نہیں۔ اگر یہ خطۂ زمین محفوظ رہا (خدا اسے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ و مستحکم رکھے) تو اس میں ایک نہ ایک دن قرآن کی شمع فروزاں ہو کر رہیگی، کیونکہ خدا نے اپنی اس آخری کتاب کو بلا مقصد محفوظ نہیں رکھا ۔۔۔۔ یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے ۔۔۔ اس کے سوا انسانیت کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں جس (اقبالؒ) نے پاکستان کا تصور دیا تھا، اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش! — پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ۔ ہر زماں جانم بلرزد در بدن!
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

——— ○ (پرویز) ○ ———

ذاتی ملکیّت ـــــ قرآن کی رُو سے

پرویز

انسان کو دنیا میں پیدا کیا گیا تو اس کی زندگی کے لئے جس قدر سامان کی ضرورت تھی اسے بھی' اس کی پیدائش کے ساتھ ہی (بلکہ اس سے بھی پہلے) مہیا کر دیا گیا ـــــ یہ اُس خدا کے (جس نے اپنے آپ کو ربّ العالمین' یعنی تمام اشیائے کائنات کو نشو و نما عطا کرنے والا کہا ہے) شایانِ شان ہی نہ تھا کہ وہ انسان کو پیدا تو کر دیتا لیکن اس کے لئے سامانِ زیست کا انتظام نہ کرتا۔ انسانی زندگی کا اوّلین مدار ہوا پر ہے۔ اسے اس نے فضا میں اس طرح پھیلا دیا کہ انسانی بچہ جہاں بھی آنکھ کھولے' وہاں اس کے لئے ہوا موجود ہو۔ اور اس سے اس کا سلسلۂ تنفّس' کد و کاوش تو ایک طرف بلاشعور و ارادہ جاری ہو جاتا ہے۔ ہوا کے ساتھ ہی اس نے روشنی، حرارت اور پانی کا بھی اسی طرح انتظام کر دیا۔ اب رہا غذا کا مسئلہ' تو انسانی بچے کی دنیا میں آمد کے ساتھ ہی' اس کی ضرورت کے مطابق' دودھ کے چشمے رواں کر دیئے۔ اس غذا (دودھ) کی کیفیت یہ تھی کہ شروع شروع میں بچے کا ہاضمہ کمزور تھا اس لئے ماں کے دودھ میں پانی کی مقدار بہت زیادہ اور غذائیت کم تھی ـــ جوں جوں بچے کی قوتِ ہضم بڑھتی گئی' دودھ میں مائیت گھٹتی گئی اور غذائیت بڑھتی گئی۔ (یعنی دودھ گاڑھا ہوتا گیا) حتّٰے کہ جب بچے میں دوسری غذا ہضم کرنے کی قوت آ گئی تو دودھ کا یہ چشمہ خشک ہو گیا اور بچہ طبعی ماں کے آغوش سے جدا ہو کر' "دھرتی ماتا" کی گود میں آ گیا جس میں اسے بقیہ عمر بسر کرنی تھی۔ زمین میں رزق کے خزانے محفوظ کر کے رکھ دیئے اور انسان سے کہہ دیا کہ وہ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق "نکالتا جائے" ـــ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ - وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ - (15/21) ہمارے پاس ہر شے کے خزانے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک معلوم پیمانے کے مطابق باہر نکلتے ہیں ـــ یعنی انسان کو اس کا علم دے دیا گیا کہ وہ زمین میں دبے ہوئے رزق کے خزانوں کو کس طرح باہر نکالے ـــ انسان کو

اس کا علم دیا اور زمین سے کہہ دیا کہ وہ اس کے احکام کی تعمیل کرے ـــ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا - اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع فرمان بنا دیا ـــ فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ - (۶۷/۱۵) کہ تم اس کی اطراف میں چلو پھرو اور خدا کے عطا کردہ رزق کو کھاؤ۔

آپ خدا کے اس نظامِ ربوبیت (نشو و نما) اور رزاقیت (سامانِ زیست مہیا کرنے) پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس میں اس کا کہیں تصور اور شائبہ تک بھی پایا جاتا ہے کہ جن چیزوں پر ایک فرد کی زندگی کا دار و مدار ہے اور جنہیں خدا نے اس حسنِ نظم کے ساتھ بلا مزد و معاوضہ مہیا کر رکھا ہے' ان پر کسی دوسرے فرد کا قبضہ ہو اور اس طرح اسے اس کا اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ چاہے تو اس شخص کو ان سے متمتع ہونے دے اور چاہے تو انہیں روک رکھے! یہ تصور خدا کی اس اسکیم کے منافی ہے جس کے مطابق اس نے انسانوں کو پیدا کیا، اور ان کی نشو و نما کا ذمہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسا سمجھنے والوں کو خدا کا منکر اور وسائل رزق پر قبضہ کرنے والوں کو اس کا ہمسر قرار دے کر انہیں مشرکین کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ دیکھئے وہ قرآن کریم کی ابتداء ہی میں اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ:

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ - فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - (۲/۲۲)

خدا وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرارگاہ (بچھونا) بنایا۔ اور اوپر فضا میں کرّے بکھیر دیئے۔ پھر ایسا انتظام کیا کہ بادلوں سے بارش برسے تو اس سے زمین سے اناج اور پھل پیدا ہوں۔ انہیں اس نے تم سب کے لئے سامانِ زیست (رزق) بنایا ہے۔
سو دیکھو! تم کہیں ایسا نہ کرنا کہ اس باب میں دوسروں کو خدا کا ہمسر بنانے لگ جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ سامان کسی انسان کا مہیا کردہ نہیں۔ خدا کا عطا فرمودہ ہے)

دوسری جگہ کہا:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا - ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ - وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ - سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ - (۴۱/۹-۱۰)

... سے کہو کہ کیا تم اس خدا (کی خالقیت اور رزاقیت) سے انکار کرتے ہو جس نے

زمین کو دو مراحل میں (اس طرح) پیدا کیا کہ وہ تمہارے بسنے کے قابل ہو گئی، اور تم اس باب میں اس کے ہمسر بنانے لگ گئے۔ حالانکہ اس نے یہ سب کچھ جملہ اشیائے کائنات اور انسانوں کی پرورش کے لئے بنایا تھا اور اس نے (اس مقصد کے لئے) زمین پر پہاڑ کھڑے کر دیئے اور اس میں خوراک پیدا کرنے کی بے انتہا صلاحیت رکھ دی۔ اور چار منازل (موسموں) میں فصلیں پیدا کرنے کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

لہٰذا، رزق کے ان خزانوں کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے (اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ کفر اور شرک ہوگا)

لیکن مستبد انسانوں نے ایسا نہ کیا اور بغض و عناد کی سے زمین پر لکیریں کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت میں لے لیا اور اس طرح کمزور انسانوں پر رزق کے دروازے بند کر کے انہیں اپنا محکوم اور غلام بنا لیا۔ قرآن کریم نے ان مستبد اقوام میں سب سے پہلے قوم ثمود کا ذکر کیا ہے کہ اس کے صاحب ثروت سرداروں نے کس طرح چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کر کے کمزور انسانوں کے مویشیوں کو خدا کے عطا کردہ رزق سے محروم کر رکھا تھا۔ ان کا یہ "کفر اور شرک" تھا جس کے خلاف جہاد کرنے کے لئے خدا کا رسول (حضرت صالحؑ) آیا۔ آپ نے ان سے جو کچھ کہا وہ حکمت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ تمام مویشی خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہیں، اور ان کی پرورش کے لئے خدا نے یہ چراگاہیں اور چشمے پیدا کر رکھے ہیں۔ تم پہلے تو ان مویشیوں کی نسبت مختلف انسانوں کی طرف کر دیتے ہو، پھر خدا کی زمین کو مختلف انسانوں کے قبضے میں دے دیتے ہو۔ اور جن کے قبضے میں زمین نہیں دیتے انہیں اور ان کے مویشیوں کو خدا کے عطا کردہ رزق سے محروم کر دیتے ہو! سوچو کہ تمہاری یہ روش کسی طرح بھی قرین عقل و دانش اور مطابق عدل و انصاف ہے؟ اس کے بعد آپ نے دو لفظ کہے، جو درحقیقت وہ ستون ہیں جن پر خدا کے تجویز کردہ نظام معیشت کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ فرمایا۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ..... فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (۷/۷۳)

یہ "اللہ کی اونٹنی" ہے۔ اسے آزاد چھوڑ دو کہ یہ "اللہ کی زمین" میں چرے۔

اللہ کی زمین ــــ اللہ کی مخلوق کے لئے ــــ بس یہ ہے خدا کا تجویز کردہ نظام معیشت۔

لیکن مستبد ارباب قوت و اقتدار اس اصول کو ماننے کے لئے کب تیار تھے؟ انہوں نے وعدہ کر لینے کے باوجود، اس سے انحراف کیا۔ (اور پھر اس غلط معاشی نظام کا نتیجہ بھی بھگتا)

یہی فرعون کا دعوےٰ تھا جو اپنی قوم سے کہتا تھا کہ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۔ (۴۳/۵۱) کیا ملک مصر اور اس میں جو نہریں بہتی ہیں، میری ملکیت نہیں؟ رزق کے سرچشموں پر یہی وہ ذاتی ملکیت کا دعوےٰ تھا جس کی بنیاد پر وہ کہتا تھا کہ ۔ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ۔ (۷۹/۲۴)۔۔۔ میں ہی تمہارا "اَن داتا" (رزق دینے والا) ہوں، اور اسی لئے غلبہ واقتدار بھی میرا ہی ہے۔

یہ روش قوم ثمود یا فرعونِ مصر تک ہی محدود نہیں رہی۔ انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی فساد انگیز اور انسانیت کُش داستان ہے۔ مستبد قوتیں "ارض اللہ" کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے لیتی تھیں اور خدا کے رسول، اس سرچشمۂ رزق کو ان کے ہاتھوں سے چھین کر، خدا کی مخلوق کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑنے کے لئے آتے تھے۔ یہ کشمکش جاری رہی تاآنکہ خدا نے اس نظامِ معیشت کو ۔۔۔ کہ وسائل رزق ضرورتمندوں کے لئے عام رہنے چاہئیں ۔۔۔ اپنی آخری کتاب میں نہایت واضح، کھلے اور نکھرے ہوئے انداز سے بیان کر کے، اسے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا، اور اس ضابطہ قوانین (قرآن) کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر، رسولوں کے آنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔

آپ قرآن کریم کو الحمد سے والناس تک دیکھ جائیے، ورق ورق پر یہ حقیقت کھلی ہوئی ملے گی کہ رزق کے سرچشموں پر ملکیت خدا کی ہے اور انسانوں کو ان سے صرف تمتع (فائدہ اٹھانے) کا حق حاصل ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خدا جملہ کائنات کا خالق ہے۔ اگر خالق اپنی مخلوق کا مالک نہیں تو اور کون اس کا مالک ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر ذی ہوش کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں کہا۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ ۔۔۔۔۔۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کا مالک کون ہے؟ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ (۲۳/۸۴-۸۵)۔ یہ اس کا اعتراف کریں گے کہ اللہ ہی اس کا مالک ہے۔ سورۂ نمل میں یہی کچھ کہنے کے بعد کہا کہ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔ (۲۷/۶۰)۔ یعنی جب زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کا مالک خدا ہے، تو تم اوروں کو زمین کا مالک قرار دے کر، خدا کے ساتھ اور الٰہ تجویز کرتے ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کی ملکیت میں کوئی اور بھی شریک ہو سکے۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ ۔ (۱۷/۱۱۱) اس کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کے بیسوں مقامات میں ہے۔ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ (۲/۲۸۴)۔ یا لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ (۲/۲۵۵) ارض و سماء میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک خدا ہے۔ زمین کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا۔ اَرْضُ اللّٰهِ ۔ (۷/۷۳)۔ "خدا کی زمین"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے اس کا مالک بھی وہی ہے اور اس میں وہ

کسی دوسرے کو حقِ ملکیت نہیں دیتا۔ ایسا سمجھنا خدا کے ساتھ اوروں کو الاٹ بنانا ہے۔

اب آیئے اس طرف کہ انسان کی اس باب میں کیا پوزیشن ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (۲/۲۹)

خدا وہ ہے جس نے، جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے۔ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ "ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے سب اللہ کے لئے ہے"۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ "ارض میں جو کچھ ہے اللہ کے لئے ہے" (لِلّٰهِ) اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ ارض میں جو کچھ ہے سب تمہارے (یعنی انسانوں کے) لئے ہے"۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں لیکن ان میں تضاد نہیں (قرآن میں کہیں بھی تضاد و اختلاف نہیں) جو حضرات عربی زبان سے تھوڑی سی بھی شدبد رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں (لِ) دو معانی کے لئے آتا ہے۔ ایک ملکیت کے لئے (اسے لامِ تملیک کہتے ہیں) اور دوسرا انتفاع (محض نفع حاصل کرنے) کے لئے (اسے لامِ انتفاع کہتے ہیں) قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں جہاں (اللہ) کے ساتھ (لام) آئے گا (مثلاً لِلّٰهِ یا لَہٗ) وہ لامِ تملیک ہوگا۔ اور جہاں انسانوں کے لئے ہوگا وہ لامِ انتفاع ہوگا۔ بنابریں لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ کے معنی ہوں گے "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت ہے"۔ اور لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ کے معنی ہوں گے "زمین میں جو کچھ ہے سب اس لئے ہے کہ تم اس سے فائدہ حاصل کرو۔ اگر انسانوں سے متعلق آیات میں بھی (لام) تملیک کا سمجھا جائے تو یہ وہی شرک ہوگا جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے لہٰذا، ارض (یعنی جملہ ذرائع پیداوار) کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں۔ مثلاً

(۱) انسانوں کے لئے زمین میں مستقر (ٹھہرنے کی جگہ) اور متاع (سامانِ زیست) ہے۔ (۲/۳۶)، (۷/۲۴)

(۲) زمین میں تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے متاع (سامانِ زیست ہے)۔ (۷۹/۳۳)، (۸۰/۳۲)

(۳) وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ۔ ہم نے زمین میں تمہارے لئے روزی کا سامان رکھا ہے۔ (۷/۱۰)، (۱۵/۲۰)

(۴) تم اس سامانِ زیست کو خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴)

(۵) زمین میں جو کچھ ہے رِزْقًا لِّلْعِبَادِ۔ ہے۔ بندوں کے لئے رزق۔ (۵۰/۱۱)

(۶) خدا نے جو رزق طیب تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ۔ (۲/۱۷۲)، (۵/۸۸)، (۶/۱۴۲)، (۱۶/۱۱۴)، (۲۰/۸۱)۔

(۷) جو کچھ ہم نے تمہارے لئے (لکم) زمین سے نکالا ہے .... (۲/۲۶۷)

(۸) ارض و سما میں جو کچھ ہے اس نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ (۳۱/۲۰) ؛ (۴۵/۱۳)

(۹) اس نے ارض کو تمہارے لئے مھد (آرام گاہ) بنایا۔ (۲۰/۵۳) ؛ (۷۸/۶) ؛ (۴۳/۱۰)، بساط بنایا۔ (۷۱/۱۹)

(۱۰) وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۔ (۵۵/۱۰) اس نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا۔

ان (اور ان جیسی اور بے شمار) آیات میں (لکم یا للانام) لام انتفاع کے لئے ہے، تملیک کے لئے نہیں۔ لہٰذا ارض پر کسی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام مخلوق کیلئے رزق کا ذریعہ ہے اس لئے اسے تمام مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ (سَوَاءً لِّلسَّائِلِیْنَ ۔ ۴۱/۱۰) یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ہے (۵۶/۷۳) یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ زیست۔ اس لئے اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ زمین کے کسی ٹکڑے کو کسی کی ذاتی ملکیت قرار دے دیں گے تو وہ ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی نہیں رہے گی۔ وہ اس فرد کے قبضہ میں چلی جائے گی جسے وہ جس طرح جی چاہے استعمال کرے اور جس پر جی چاہے اس کے دروازے بند کر دے۔ یاد رکھیئے! جس چیز کی نسبت خدا نے بالخصوص اپنی طرف کی ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان (بلکہ مخلوقِ خداوندی) کے فائدہ کے لئے کھلی رہنی چاہیئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ (مثلاً) اس نے کعبہ کو بَیْتِیَ (میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اس نے زمین کو بھی "ارض اللہ" کہا ہے اس کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے جیسی کعبہ کی۔ نہ اس پر کسی کا ذاتی قبضہ ہو سکتا ہے نہ اُس پر۔

---(۰)---

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ

(۱) زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

(۲) زمین کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ اس سے تمام نوعِ انسانی کو رزق (سامانِ زیست) ملتا رہے۔

(۳) زمین میں رزق کے خزانے بے انتہا ہیں۔ لیکن اس میں سے رزق ایک وقت میں ایک معین مقدار کے مطابق نکلتا ہے۔ اور اس مقدار کو انسانی علم اور سعی و کاوش کی رُو سے بڑھایا جا سکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب زمین سے رزق پیدا کرنے اور اس سے تمام نوعِ انسانی کی ضروریات پورا کرنے کا کام خاص نظم و نسق کے مطابق سر انجام پائے۔ اس نظم و نسق کی مشینری کو مملکتِ خداوندی، اسلامی حکومت یا قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ یہ حکومت خدا کی اس عظیم

ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ ادا کرتی ہے جو اس نے یہ کہہ اپنے اوپر لی تھی کہ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ - (۶/۱۵۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار۔

بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے جہاں کہا کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو" یہ اس مملکت کے سوچنے کی بات ہوگی کہ وہ زمین کا انتظام کس طرح کرے جس سے وہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکے۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر زمین مختلف افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو پھر کوئی مملکت بھی اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتی۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ زمین مملکت (یا اسلامی معاشرہ) کی تحویل میں رہے۔

ہم نے "تحویل" کا لفظ خاص طور پر اس لئے لکھا ہے کہ زمین اگر افراد کی ملکیت میں نہیں جا سکتی تو وہ مملکت (STATE) کی ملکیت بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اس کی اس ملکیت میں نہ کوئی فرد شریک ہو سکتا ہے نہ مملکت۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن نے جب "ارض" کے متعلق کہا ہے کہ اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اس سے یہ مراد نہیں کہ زمینداری تو قرآن کی رُو سے جائز نہیں لیکن صنعت و حرفت (INDUSTRIES) پر ذاتی ملکیت جائز ہے۔ بالکل نہیں۔ آپ کوئی انڈسٹری لے لیں، اس کی بنیاد (بالواسطہ یا بلاواسطہ) ان چیزوں پر ہوگی جو زمین سے نکلتی ہیں۔ قرآن نے جب مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ (۲/۲۶۷) کہا ہے تو اس سے مراد صرف غلہ یا پھل نہیں۔ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو زمین سے برآمد ہوتی ہے۔ یہی وہ خزائن السّمٰوٰت وَالْاَرض ہیں (۶۳/۷) جو خدا کی ملک ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں، قرآن کریم کے اس اساسی اصول کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا مالک ہو سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ کی رُو سے واضح کیا ہے جس میں مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۲/۲۶۷) میں تفریق کی گئی ہے۔ مَا كَسَبْتُمْ، انسان کی محنت کا ماحصل ہے جس کا وہ مالک ہو سکتا ہے، اور مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وہ اشیا ہیں جنہیں خدا نے انسان کے فائدے کے لئے زمین سے نکالا ہے۔ جو کچھ زمین سے خام پیداوار کی شکل میں برآمد ہوتا ہے، وہ تو ایک طرف رہا، وہ فصلوں کی کاشت کے سلسلہ میں بھی انسانی محنت اور خدا کے عطا کردہ

ذرائع پیداوار میں فرق کر دیتا ہے۔ آپ ذرا سورۃ الواقعہ کی آیات (۶۳ - ۷۳) پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ اس فرق کو کس قدر لطیف، حسین اور بلیغ انداز میں واضح کرتا ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے۔

تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارے نظام کا کس قدر؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ اگر ہمارا قانون سازگار نہ ہو تو تمہاری کھیتی تہس نہس ہو جائے، اس طرح کہ اس سے غلّہ حاصل ہونا تو ایک طرف، تمہارا بیج بھی ضائع چلا جائے اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ کہ ہمارا سب کچھ رائگاں گیا۔

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ ساری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا نظامِ مشیت ایسا کرتا ہے؟ اگر بارش کا پانی ویسا ہی کھاری رہتا جیسا یہ سمندر میں ہوتا ہے، تو تم کیا کر لیتے؟

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کرتے ہو۔ کہو کہ ان درختوں کو تم اگاتے ہو یا ہمارا نظامِ طبیعی ایسا کرتا ہے۔

تم کسی نہج سے بھی غور کرو، لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس تمام کاروبار میں تمہاری صرف محنت ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ خدا کا عطا فرمودہ ہوتا ہے۔ اس سے تمہیں یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں بن جاتا۔ وہ بھوکوں کے لئے سامانِ زیست ہوتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا، کہ جس چیز کو انسان کی محنت کا ماحصل قرار دیا جاتا ہے اس میں بھی کس قدر حصہ عطایۂ خداوندی کا ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ اس مال کے متعلق بھی کہتا ہے۔ مَالَ الَّذِیْ اٰتٰىكُمْ (۲۴/۳۳) "اللہ کا مال جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے"۔ لیکن خدا کے اس عطا کردہ مال کو وہ "اموال الناس" یا "اموالکم" (تمہارا مال) کہہ کر پکارتا ہے۔ (زمین کو اس نے کہیں بھی "ارض الناس" نہیں کہا)۔ لیکن مومن اپنے اس مال کو بھی خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے (اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ - ۹/۱۱۱)، وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر رکھتا ہے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ (یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ - قُلِ الْعَفْوَ - ۲/۲۱۹) اس کے برعکس، قارون یہ کہتا ہے کہ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ - (۲۸/۷۸) یہ سب میری

اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے میں اس میں سے کسی اور کو کیوں دوں!

بہرحال، یہ ہے وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا کہ ارض (یعنی وسائل پیداوار) پر کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام نوعِ انسان کی پرورش کا ذریعہ ہیں اور انہیں اسی مقصد کے لئے کام میں لانا چاہیئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضمناً اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں بعض مقامات پر آیا ہے کہ خدا نے انسانوں کو ارض کا وارث بنایا ہے۔ ان مقامات میں وراثتِ ارضی سے مراد حکومت ہے (زمین پر ذاتی ملکیت نہیں) مثلاً سورۂ اعراف میں، داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں فرمایا کہ فرعون اور اس کی قوم کو تباہ کر دیا گیا۔ "اور جس قوم کو کمزور کر دیا گیا تھا اسے ہم نے مملکتِ فرعون کے شرق و غرب کا وارث بنا دیا۔ (۱۳۷/۷) اسی طرح جماعتِ مومنین کے متعلق کہا کہ "تمہارے دشمنوں کو تباہ کر دیا اور تمہیں ان کی ارض، اموال، اور دیار کا وارث بنا دیا۔ (۲۷/۳۳) نیز (۳۹/۷۴) یہی وہ وراثتِ ارض ہے جسے وہ ان بندوں کو دیتا ہے جن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ (۱۰۵/۲۱) و (۱۲۸/۷) بہرحال، یہ نکتہ ضمناً سامنے آگیا تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم کی رُو سے، زمین (وسائل پیداوار) پر ذاتی ملکیت کا تصور ہی باطل، اور شرک کے مرادف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو نہ صرف زمینداری اور جاگیرداری کا تصور ختم ہو جاتا ہے بلکہ زمین پر جائیدادیں کھڑی کرنے اور اس سے برآمد ہونے والی اشیاء کو ذاتی ملکیت قرار دے کر بڑی بڑی صنعتوں (انڈسٹریز) کا مالک بن جانے کا تصور بھی باطل ہے۔ زمین، اور جو کچھ اس میں سے نکلتا ہے وہ خدا کی ملکیت ہے۔ اور اس نے اسے تمام ضرورت مندوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے عام کر دیا ہے۔ مملکتِ خداوندی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کا نظم و نسق اس انداز سے کرے جس سے اس کا یہ مقصدِ تخلیق اور منشائے خداوندی پورا ہو جائے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کی زندگی قرآنی تعلیم کا عملی مظاہرہ تھی۔ اس لئے ہمارا ایمان ہے کہ اُس دور میں قرآن کا یہ نظام عملاً نافذ کیا گیا تھا۔ وہ تاریخ جو اس کے برعکس کچھ کہتی ہے، ہمارے دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھی اس لئے وہ جاگیردارانہ فضا کی پیدا کردہ ہے، فلہٰذا، ناقابلِ اعتماد۔ اس میں سے وہی حصہ قابلِ تسلیم قرار دیا جا سکتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں جب اسلام ہی اپنی حقیقی شکل میں باقی نہیں رہا تھا تو حقیقی اسلام کی تاریخ کس طرح علیٰ حالہٖ رہ سکتی تھی۔ یہی (دورِ ملوکیت میں وضع شدہ) اسلام اب تک رائج چلا آرہا ہے، اور اسی اسلام کے علمبردار نظامِ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو عین مطابقِ شریعت قرار دے کر اس قسم کے فتوے صادر فرماتے رہتے ہیں کہ:

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا

تجارتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز، اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو .... اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدو نہایت رکھی جا سکتی ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین، سید ابوالاعلیٰ مودودی ص۴۲ تا ص۵۲)

یہ ٹھیک ہے کہ جائز طریق سے جائز چیزوں کی ملکیت جائز ہوتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ زمین پر ذاتی ملکیت کسی صورت میں بھی جائز قرار پا سکتی ہے؟ زمین پر ملکیت کی عام طور پر دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا آپ اسے کسی شخص سے خریدیں اور یا اسے وراثت میں حاصل کریں۔ نظر بظاہر یہ دونوں صورتیں جائز تصور کی جائیں گی۔ لیکن سوچئے کہ جس شخص سے آپ نے زمین خریدی یا جس سے وراثت میں پائی ہے، کیا زمین پر اس کا قبضہ جائز تھا؟ اسے سمجھنے کے لئے آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے اور وہاں تک پہنچ جائیے جہاں سب سے پہلے شخص نے زمین کو اپنے قبضہ میں لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے نہ تو زمین کو کسی سے خریدا تھا اور نہ ہی کسی سے وراثت میں حاصل کیا تھا اس نے محض دھاندلی سے ایک قطعۂ زمین پر لکیریں کھینچ کر اسے اپنی ملکیت قرار دے لیا تھا۔ اس طرح حاصل کردہ زمین پر قبضہ کو تو کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تو جب اس کا قبضہ ناجائز تھا تو اس سے جس نے اسے خریدا یا وراثت میں پایا اس کا قبضہ کیسے جائز قرار پا جائے گا؟ یہ تو عام قانون ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے ایسی چیز خریدتا ہے جس پر بیچنے والے کا ناجائز قبضہ تھا، تو خرید و فروخت کا وہ سودا کالعدم قرار پا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، چوری کا مال خریدنے والا بھی چور کے ساتھ برابر کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہٰذا، جن چیزوں کو خدا نے نوعِ انسان کی نشو و نما کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے، انہیں یہ کہہ کر اپنے قبضہ میں لے لینا کہ میں نے اسے فلاں شخص سے خریدا یا وراثت میں حاصل کیا ہے، بنیادی طور پر باطل ہے۔ ناجائز قبضہ دس بیس نسلیں گزرنے پر جائز نہیں بن سکتا۔ جو شے اپنی اصل کے اعتبار سے باطل ہے، وہ مرورِ زمانہ کے بعد حق نہیں ہو سکتی۔

یہ حضرات جو زمین پر ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کی حالت عجیب ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی اس آیت سے کہ "الحکم للہ" یہ ثابت کرتے ہیں (اور بجا طور پر ثابت کرتے ہیں) کہ حکومت کا حق صرف خدا کا ہے۔ کسی انسان کو حقِ حکومت نہیں پہنچتا۔ لیکن جب ان کے سامنے اسی قسم کی دوسری آیت

(الارض للہ) پیش کی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی ان کی سمجھ میں نہیں آتے کہ زمین پر حقِ ملکیت صرف خدا کا ہے کسی انسان کو اس پر ملکیت کا حق حاصل نہیں۔ اس کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ صرف خدا کی شانِ ملکوتی کا بیان ہے اور بس [1] اسی ذہنیت کے حامل حضرات کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ،

حق زمین را جز متاعِ ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است　　(جاوید نامہ)

" الارض للہ" سے مقصود خدا کی شانِ ملکوتی کا اظہار ہی نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست
ایں "متاع" بندہ و ملکِ خداست

اور دنیا میں اس وقت جس قدر فساد برپا ہے اس کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ:

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

آج ہم چلا رہے ہیں کہ معاشرہ میں (CORRUPTION) اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اس کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ قانون اس کی روک تھام سے عاجز اور انتظامیہ اس کے انسداد سے بے بس ہو چکا ہے۔

---

[1] آج کل یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ مُردے کی آنکھوں (یا دیگر اعضاء) کو زندہ انسانوں کے فائدے کے لئے بطور عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کا فتویٰ یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے عطیہ کے حق میں ہیں انہوں نے تصور کر لیا ہے کہ

آدمی اپنے جسم کا ہر طرح سے مالک و مختار ہے اور اپنے پورے جسم یا اپنے کسی حصے کو اپنی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ کی طرح جس طرح چاہے فروخت یا ہبہ کر سکتا ہے۔ یہ تصور بجائے خود غیر اسلامی ہے...... اسلامی نقطۂ نظر سے انسان اپنے جسم کا مالک و مختار نہیں بلکہ امین و پاسبان ہے۔　(ایشیا۔ بابت ۱۷ مارچ ۱۹۶۸ء)

یعنی انسان اپنے جسم کا مالک و مختار تو نہیں لیکن زمین، جسے خدا نے بالفاظ صریح "الارض للہ" کہا ہے اس کا انسان اس طرح سے مالک و مختار ہے کہ اس کے ساتھ جو جی میں آئے کرے! یا للعجب۔

اس سے مایوسی عام ہو رہی ہے۔ لیکن آپ اس کا وہ علاج کیجئے جو قرآن نے تجویز کیا تھا اور پھر دیکھئے کہ اس لاعلاج مرض کا علاج کس طرح حتماً نہیں ہو جاتا ہے۔ یعنی پرائیویٹ پراپرٹی ختم کر دیجئے اور ہر شخص کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا، مملکت کا فریضہ قرار دے دیجئے۔ یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ جہنم کس طرح دنوں میں جنت ارضی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پرائیویٹ پراپرٹی کے حق میں ان حضرات کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں وراثت کے احکام اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اول تو یہ دیکھئے کہ وراثت میں وہی چیزیں مل سکیں گی جن پر متوفی کا جائز قبضہ ہو۔ جن چیزوں پر اس کا قبضہ ہی نہ ہو سکتا ہو انہیں وہ وراثت میں کیسے منتقل کر سکے گا۔؟ وراثت میں پرسنل پراپرٹی (اشیائے مستعملہ وغیرہ) منتقل ہو سکیں گی نہ کہ زمین اور اس پر کھڑی کی ہوئی جائیدادیں۔

پھر قرآن کریم کے قوانین و احکام کے سلسلہ میں اس اصولی حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن اپنے منتہیٰ تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ کی موجودہ حالت کو تدریجاً بدلتا ہوا اسے آخری منزل تک لے جاتا ہے۔ اس کے بیشتر احکام اس عبوری دور سے متعلق ہوتے ہیں۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ اس نے شراب (خمر) جیسی ام الخبائث کو بالکلیہ ممنوع قرار دینے میں قریب پندرہ سولہ برس کا عرصہ لیا۔ اور اس دوران میں اس کے لئے بتدریج احکام دیتا رہا۔ قرآن میں صدقہ۔ خیرات۔ وراثت وغیرہ کے احکام اُس دور سے متعلق ہیں، جب قرآن کا معاشی نظام اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوا ہو۔

قرآنِ کریم نے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کو امت کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ حضورؐ نے نہ جائیدادیں کھڑی کیں، نہ ہی کچھ ورثہ میں چھوڑا۔ تو کیا حضورؐ کا یہ عمل منشائے قرآنی کی صحیح تعبیر اور امت کے لئے اسوۂ حسنہ نہیں؟ لیکن یہاں تو مشکل یہ ہے کہ یہ حضرات مسواک کرنے اور ناخن ترشوانے کی سنت نبویؐ کو تو اس شد و مد سے پیش کرتے ہیں لیکن کسی محراب و منبر سے حضورؐ کی اس سنت کو سامنے نہیں لایا جاتا جس کی رو سے حضورؐ نے نہ دولت جمع کی، نہ جائیدادیں کھڑی کیں، نہ کچھ ترکہ میں چھوڑا۔ جب ان سے کہو تو جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حضورؐ کے لئے خصوصی احکام تھے، عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھے۔ حیرت یہ ہے کہ یہ بات کس قدر جسارت کے ساتھ کہہ دی جاتی ہے، جو احکام حضورؐ کی ذات کے لئے مخصوص تھے ان کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں خاصۃ لک من دون المومنین کہہ دیا (۳۳/۵۰) حضورؐ کی اس روشِ زندگی کے متعلق تو قرآن نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ یہ حضورؐ کے لئے مختص تھی۔ امت کے لئے احکام جداگانہ تھے!

بہرحال، وسائلِ پیداوار کے متعلق قرآن کریم کے احکام سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں، اور یہی ہے وہ نظام جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔ لیکن، انسانیت کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس نظام کو وحیٔ خداوندی نے انسانیت کی مشکلات کا حل بتایا، مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانیت اگر ایک جہت سے وحی کے قریب آئی تو دوسری جہت سے اس سے دور تر چلی گئی۔ یہی کچھ پہلے ہوا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ جب یورپ میں سائنٹیفک انکشافات (تسخیرِ فطرت) کا دور شروع ہوا تو مذہبی پیشوائیت نے اس کی سخت مخالفت کی۔ نتیجہ یہ کہ وہاں کے اربابِ فکر و بصیرت نے سائنٹیفک طریقِ تحقیق کو تو اختیار کر لیا (اور اس طرح اس گوشے سے منشائے خداوندی کے قریب آگئے) لیکن مذہبی پیشوائیت کے ردِّ عمل کے طور پر انہوں نے وحی کی حقیقت سے انکار کر دیا اور اس طرح یورپ میں مادہ پرستی کا دور شروع ہوگیا جو رفتہ رفتہ ساری دنیا پر چھا گیا۔ اب معلوم نہیں دنیا کو وحی کی حقیقت تسلیم کرنے میں کتنا عرصہ لگ جائے گا۔

اسی طرح، جب اشتراکیوں نے سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھائی تو مذہبی پیشوائیت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ روشِ خدا کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اشتراکیوں نے کہا کہ اگر تمہارا خدا نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے تو ہمارا اس خدا کو سات سلام۔ یوں وہ، اگر "لاسلاطین، لاکلیسا" کے گوشے سے، منشائے خداوندی کے قریب آئے، تو "لا الٰہ" کہہ کر اس سے دور تر چلے گئے۔ یہ ہے جو کچھ مذہبی پیشوائیت دینِ خداوندی کے ساتھ کرتی چلی آئی ہے، اور یہی کچھ آج کر رہی ہے۔ آج جب یہ آواز بلند کی جاتی ہے کہ سرمایہ داری کا نظام دین کی نقیض اور منشائے خداوندی کا حریف ہے، تو مذہبی پیشوائیت اس کے خلاف شور مچا دیتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری ان حضرات کے فتووں سے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے تو بہرصورت ختم ہونا ہے۔ ڈر یہ ہے کہ اگر ہم نے اسے دین کی رو سے ختم نہ کیا تو یہ اشتراکیت کے ذریعے ختم ہوگا لیکن اس کے ساتھ انسانی معاشرہ پر لادینی بھی چھا جائے گی اور پھر نہ معلوم انسان کو دین کی طرف آنے میں کتنی صدیاں لگ جائیں۔ خطرہ کا یہی وہ احساس ہے جس کے پیشِ نظر، میں برسوں سے یہ آواز بلند کر رہا ہوں کہ مسلمانوں (اور ان کے ساتھ ہی پوری انسانیت) کو یورپ کی لادینی سیاست و معاشرت اور اشتراکیت کے خدا فراموش فلسفۂ حیات پر مبنی نظامِ معیشت سے بچانے کے لئے (کم از کم) پاکستان میں، قرآنی نظامِ حیات متشکل کر دیا جائے جس کا ایک گوشہ یہ ہے کہ وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور مملکت تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ یہ نظام بہرحال، تدریجاً نافذ ہوگا لیکن اسے اپنی منزلِ مقصود قرار دے کر، اس کی طرف پہلا قدم تو ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ انسانیت کا درد، اور

دین کی عظمت کا شعور رکھنے والے حضرات کو اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ نظامِ مملکت پر مذہبی پیشوائیت اثر انداز نہ ہو۔ جس قدر کسی معاشرہ پر مذہبی پیشوائیت کی گرفت ہوگی، اسی نسبت سے اس معاشرہ میں نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور اس کا نظامِ حیات دین سے دور ہٹتا چلا جائے گا۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے ہاں قرآن کا نظامِ حیات متشکل کرنے کی طرف قدم اٹھائیں؟ اگر ہم نے اب بھی ایسا نہ کیا تو شاید زمانہ کی برق رفتاری ہمیں مزید مہلت نہ دے۔ وَ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرینِ معاشیات وسیاسیات نے کیا سوچا؟

اسے پڑھیئے اور سوچیئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت - بارہ روپے ۱۲

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

عنایت اللہ

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

[طلوع اسلام کی جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے لمعات میں لکھا گیا تھا کہ مودودی صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ "عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے" اور اس کے ثبوت میں انہوں نے لکھا تھا کہ "جنگ کی ضروریات کے لئے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے"۔ اس پر ہم نے لکھا تھا کہ :

> ایک سچا مسلمان سپاہی جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیئے جائیں وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائیگا۔

محترم عنایت اللہ صاحب یوں تو بزم طلوع اسلام میں بھی نووارد نہیں، لیکن جن حضرات کی نظروں سے ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" گذرتا ہے وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی کوائف نگاری کے لئے انہیں گویا اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ (غالباً) طلوع اسلام کی محولہ بالا بحث سے متاثر ہو کر کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا اُن کے علم میں کوئی ایسے واقعات آئے ہیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے گرفتار ہونے والے سپاہیوں نے جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی ہو۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا، اسے انہوں نے طلوع اسلام میں اشاعت کے لئے بھیج دیا ہے کہ اس کے اوراق ہی اس سوال اور جواب کے لئے موزوں تھے۔ ہم اُن کے رشحاتِ قلم کو بہ مسرت درج ذیل کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری فوج کے سپاہیوں کا کردار کیا تھا اور مودودی صاحب جن کی ساری سیاست "دروغ مصلحت آمیز" کے شرعی وجوب کی ابلہ فریب

داستان ہے، انہیں کیا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ طلوع اسلام]

مجھ سے پاک فوج کے متعلق ایک عجیب سوال پوچھا گیا ہے۔ میں اس پر حیران نہیں کہ یہ سوال کسی عالم فاضل سے پوچھنے کی بجائے مجھ سے پوچھا گیا بلکہ حیرت اس پہ ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بے معنی سوال پیدا کیسے ہوا ہے۔ سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ پاک فوج کے وہ افسر اور سپاہی جو جنگ ستمبر میں بھارت کے جنگی قیدی ہو گئے تھے، کیا انہوں نے پوچھ گچھ کے دوران جھوٹ بولا تھا؟ یعنی اپنی فوج کے متعلق دشمن کو یہ کہہ کر کچھ نہیں بتایا تھا کہ "ہمیں معلوم نہیں" حالانکہ انہیں معلوم تھا اور انہوں نے جھوٹ بولا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ کیا اپنی جان اور ملک کی سلامتی کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے؟

میں یہ سوال سن کر پریشان سا ہو گیا۔ میں یونہی مزاحاً (یا شاید سنجیدگی سے) ایک مولوی صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ مولانا! کیا ان حالات میں جھوٹ بولنا جائز ہے؟ ــــ مولانا کھنکارے، گلا صاف کیا، مجھے گھورا، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، عصا کو زمین پر مارا ــــ اور میں لرزہ براندام کہ دیکھئے اس بحر سے اچھلتا ہے کیا!

مولانا مجھے منطق اور لغت کی اندھیری بھول بھلیوں میں لے گئے۔ بات کو جس قدر الجھا سکتے تھے الجھایا اور نصف گھنٹہ بعد مجھ پر یہ انکشاف کیا روزمرہ کی زندگی میں کسی بھی موقعہ پر دروغ برائے مصلحت جائز ہے یعنی جہاں آپ اپنے مفاد کو خطرے میں دیکھیں آپ شرعاً جھوٹ بول سکتے ہیں ــــ مولانا نے مجھے ایک فتویٰ بھی دکھا دیا جس میں صاف لکھا تھا ــــ "..... عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اسکے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

میں اس جھنجٹ میں پڑنے سے گریز کروں گا کہ شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے یا نہیں کیونکہ میں نہ تو عالم ہوں، نہ میرے ڈاڑھی ہے۔ میں صرف پاک فوج کے جانبازوں کے کردار کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ جنگی قیدی ہو جانے کی صورت میں جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ مندرجہ بالا فتوے میں یہ بھی لکھا تھا ــــ "..... اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے، تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔"

غالباً اسی فتوے کا فتور تھا کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا پاک فوج کے جنگی قیدی جھوٹ بولتے رہے ہیں ــــ؟

جی نہیں!

اگر میرا یہ دو لفظی جواب کافی نہ ہو تو میں وضاحت کئے دیتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ تر عملی دلائل

ہیں۔ علمی دلیل صرف اتنی سی دوں گا کہ اخلاقیات اور نفسیات کی رُو سے مضبوط کردار کی بنیادی مضبوطی حق گوئی اور راست بازی ہوتی ہے۔ اگر بنیاد میں یہ عنصر ناپید ہے تو کردار کھوکھلا ہے۔ علمِ نفسیات کی روشنی میں جھوٹ بولنا ایک نفسیاتی مرض ہے جس کے "جراثیم" صرف کھوکھلے کردار میں پنپ سکتے ہیں۔ جھوٹ کی صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے اور اس کا نام جھوٹ ہے۔ "دروغ برائے مصلحت" کسی دوسری قسم کا نام نہیں۔ جھوٹ ہمیشہ برائے مصلحت یعنی اپنے مفاد کی خاطر ہی بولا جاتا ہے خواہ اس کا بولنے والا "صالحین" میں سے ہو اور خواہ "فاسقین" میں سے۔ اور یہ وہی جھوٹ ہے جس کی سخت مذمت قرآن نے کی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ میں نے ایک روز اپنے ایک استاد (شہید) کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ اُس نے مجھے بے تحاشہ پیٹا، اور اُس روز اُس نے اپنا پیریڈ (PERIOD) ہمیں صرف اتنی سی بات ذہن نشین کرانے میں صرف کر دیا تھا کہ جھوٹ سو برائیوں کی جڑ ہوتا ہے اور یہ کہ جو انسان جھوٹ بول سکتا ہے وہ اپنی ماں اور بہن تک کو فریب دینے سے گریز نہیں کرتا۔

ضمناً یہ بھی بتا دوں کہ میرا یہ استاد اگست ۱۹۴۷ء میں امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں کی یلغار کے سامنے بندوق لے کر مورچہ بند ہو گیا تھا۔ اُس نے دشمنوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر کے، کئی گھرانوں کو خیریت سے امرتسر سے نکال دیا تھا اور خود ایمونیشن ختم ہو جانے کے بعد شہید ہو گیا تھا۔ اُس کی شہادت نے کئی مسلمان عورتوں کی عصمت کو محفوظ پاکستان پہنچا دیا تھا۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کے لئے کردار میں ایک خلا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ خلا صرف اُس کردار میں پایا جاتا ہے جس کی کئی کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہوں۔ جس کردار کی کڑیاں موجود اور مضبوط ہوں اس میں جھوٹ کے لئے ذرہ بھر خلا نہیں ملتا۔ یہ قانونِ فطرت ہے جس کے لئے کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔

اب پاک فوج کے سپاہی کی طرف آیئے۔ اس مردِ مجاہد کے کردار کی مضبوطی کی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن ایک صاحبِ عقل کو مطمئن کرنے کے لئے اتنی سی دلیل کافی ہے کہ پاک فوج کے سپاہی نے کشمیر کی دفاعی جنگ حق کی خاطر لڑی تھی۔ اُس نے صرف دو لاکھ کی نفری سے دشمن کے ساڑھے دس لاکھ کے لشکر کا مقابلہ اور تاریخ کا شدید ترین حملہ صرف حق گوئی اور بیباکی کے بل بوتے پر جیتا تھا۔ اور جنہیں حق عزیز ہوتا ہے انہیں اپنی جان پیاری نہیں ہوتی۔ انسان کے سامنے سب سے بڑا مفاد اپنی جان کی حفاظت ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے کردار کے لئے سب سے کٹھن امتحان ہوتا ہے۔

لیکن پاک فوج کے سپاہی نے سب سے پہلے بلا طلب خاطرِ حق کے لئے موت کو قبول کیا، اور جب وہ اس کا فیصلہ کر چکا تو پھر وہ اُن مفادات سے آزاد ہو گیا جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے

میں نے واہگہ سیکٹر میں لڑنے والے ایک سپاہی سے اُس جذبے کی وضاحت چاہی جس کے تحت وہ لڑا تھا۔ اُس نے سوچ سوچ کر جواب دیا — "جب دشمن کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں شہید ہو گیا ہوں پھر میں بےخوف ہو کر لڑا۔ ایسے معلوم ہوتا رہا جیسے میری روح لڑ رہی ہے۔ لیکن فائر بندی کے بعد پتہ چلا کہ میں زندہ ہوں ..." ... اُس کی بات کو دوسرے سپاہی نے اس طرح مکمل کر دیا — "خوش نصیب تھے وہ جو شہید ہو گئے۔ ہمیں تو یہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہم زندہ ہیں۔"

ایک میجر نے کہا: "شہید ہونے کے لئے لاشعوری تیاری (UNCONSCIOUS PREPAREDNESS) کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑے ہی بلند کردار میں پائی جاتی ہے۔ مجھے دُکھ سا ہوتا ہے جیسے میرے کردار میں یہ خوبی نہیں تھی۔" — وہ اپنے کردار کے متعلق غلط رائے دے رہا تھا۔ وہ لاہور کے انتہائی اگلے مورچے میں مسلسل سترہ دن اور سترہ راتیں لڑتا رہا تھا۔ پہلے روز اُس کے ساتھ تین سو پچیس جوان تھے جو آخری روز کُل پچاس رہ گئے تھے۔ یہ مورچہ بی۔ آر۔ بی سے پرے "ڈوگرئی" سے بھی دو میل آگے تھا۔ اس میجر نے سترہ دنوں اور راتوں میں دشمن کے اکیس (۲۱) شدید حملے روکے اور اس کے ایک سپاہی کو بھی بی۔ آر۔ بی تک نہ پہنچنے دیا۔

میں نے پاسبانِ لاہور، جنرل سرفراز خان سے پوچھا کہ اگر دشمن بی۔ آر۔ بی پار کر کے لاہور تک آجاتا تو اس صورتِ حال کے لئے آپ کے پاس کیا انتظامات تھے؟ — اس جری جرنیل نے جواب دیا — "میں نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا کہ ہم دشمن کو نہر پار کرنے دیں گے۔" — انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے لے کر میرے ادنیٰ سپاہی تک نے تہیہ کر لیا تھا کہ دشمن کو نہر پار نہیں کرنے دیں گے — "ہم نے اپنی جانیں باٹا پور، بھینی، اور برکی کے ٹیلوں پر رکھ دی تھیں۔ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں تھیں — دشمن کو نہر سے پرے روک لیں گے یا ہم اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔ لہٰذا، ہمارے سامنے یہ سوال ہی نہیں آیا تھا کہ اگر دشمن نے نہر کو پار کر لیا تو ہم کیا کریں گے!"

"سب سے بڑا خطرہ جان کا ہوتا ہے۔" سیالکوٹ سیکٹر میں لڑنے والے بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) امیر عبداللہ خان نیازی نے مجھ سے کہا، "لیکن ہم نے اس خطرہ کو اپنے اعصاب سے جھاڑ کر بارکوں ہی میں پھینک دیا تھا اور خود باہر نکل آئے تھے۔"

جنگوں کی تاریخ میں جنگِ ستمبر پہلا معرکہ ہے جس میں کسی کمانڈر نے اگر فنِ حرب کے تحت برائے مصلحت اپنے سپاہیوں کو ذرا پیچھے ہٹ کر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا تو سپاہی اُس کمانڈر کو دشمن اور دشمن کا جاسوس سمجھنے لگے۔

ائیر مارشل نور خان نے غیر ملکی اخباری نمائندوں سے کہا تھا ــــ "میرے لئے مشکل یہ نہیں تھی کہ میں اپنے ہوابازوں کو دشمن کے علاقے میں حملوں کے لئے کس طرح بھیجوں۔ مشکل یہ تھی کہ انہیں حملوں پر جانے سے کس طرح روکوں"۔ پاک فوج کے کئی افسروں نے مجھے بتایا کہ ان کی سب سے بڑی دشواری یہی تھی کہ سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے کس طرح روکا جائے۔

یہ جذبہ صرف اُس انسان میں ہوتا ہے جو موت کو قبول کر چکا ہو۔ اور جو موت کو قبول کر لیتا ہے وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ یہیں سے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ دشمن کی حراست میں ہمارے جنگی قیدیوں کا اُس وقت رویہ کیا تھا جب دشمن اُن سے فوجی راز پوچھتا تھا؟ ــــ اُن کا رویہ یہ تھا کہ وہ ہر سوال کے جواب میں کہتے تھے۔ "نہیں بتائیں گے"۔

فوجیں ابھی سرحدوں پر تھیں۔ میں ہڈیارہ گیا۔ مجھے سترہ پنجاب رجمنٹ کے ایک مجاہد سے ملنا تھا۔ میں نے ستلج رینجرز کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ سترہ پنجاب رجمنٹ کہاں ہے؟ اُس نے نہایت احترام سے جواب دیا ــــ "بھائی صاحب! اگر میں سترہ پنجاب رجمنٹ کا سپاہی ہوتا تو بھی آپ کو نہ بتاتا کہ میری رجمنٹ کہاں ہے" ــــ میں وہاں سے واپس آگیا۔ یہ سپاہی کہہ سکتا تھا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اُس نے اتنا بھی جھوٹ نہیں بولا۔

بھارتیوں نے ہمارے جنگی قیدیوں کو انتہا درجہ کی غیر انسانی اذیتیں دی ہیں جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہمارے قیدی افسروں اور جوانوں نے بھارتی افسروں کے ہر سوال کا یہی ایک جواب دیا تھا ــــ "ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا اور کچھ نہیں بتائیں گے" ــــ ہم پاکستانی بھارتیوں کے اس سلوک کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کھیم کرن کے علاقے سے پکڑے ہوئے ہمارے جنگی قیدیوں کے پیٹ چاک کر دیئے تھے کیونکہ انہوں نے ہر سوال کا یہی ایک جواب دیا تھا ــــ "ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا اور کچھ نہیں بتائیں گے"۔

ہمارا ہر سپاہی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ جس سپاہی نے یہ جواب دیا ہے اس کا کیا حشر ہوا ہے لیکن جب اس کی باری آئی تھی تو وہ بھی یہی جواب دیتا تھا۔

ہمارے یہ شہید اور غازی اپنی یونٹ، بریگیڈ اور ڈویژن کے متعلق جھوٹی معلومات دے کر دشمن کی اذیت سے بچ سکتے تھے لیکن انہوں نے قطعاً ایسا نہیں کیا۔

لاہور کے محاذ پر پاک فوج کی انفنٹری کی ایک ایک دو دو کمپنیاں دشمن کی پلٹنوں کی پلٹنوں پر اور ٹینکوں کا ایک ایک سکواڈرن دشمن کی ٹینک رجمنٹوں پر جوابی حملے کرتا رہا۔ عام فہم زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارے ایک سو سے دو سو تک مجاہد دشمن کے ایک ایک ہزار پر، اور ہمارے آٹھ آٹھ ٹینک دشمن کے پچاس پچاس ٹینکوں پر حملے کرتے رہے۔ یہ جوابی حملے اس قدر تیز اور شدید تھے کہ دشمن ہمیشہ پاک فوج کی ایک سو نفری کی

کمپنی کو ایک ہزار نفری کی بٹالین اور دو چار ٹینکوں کو پچیس تیس ٹینکوں کی رجمنٹ سمجھتا رہا۔ بڈیانہ (سیالکوٹ سیکٹر) پر میجر مسعود اختر شہید نے دشمن کے پچاس ساٹھ ٹینکوں پر حملہ کیا تھا اور خدا کی دین میں مسعود شہید کے ٹینک تباہ ہوتے ہوتے صرف آٹھ رہ گئے تھے۔ لیکن اُس نے پیش قدمی جاری رکھی اور فنِ حرب کے کمال کے ایسے مظاہرے کئے کہ دشمن کی ایک ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر (کرنل تاراپور) وائرلیس پر اپنے "پچھلوں" کو اطلاع دے رہا تھا — "دشمن (پاکستانی) پوری ٹینک رجمنٹ سے حملہ کر رہے ہیں ایئر فورس بھیجو" — یہ بے تار برقی پیغام ہمارے وائرلیس سیٹوں پر بھی سنا گیا تھا۔

ہمارے دفاعی مورچوں کی نفری بھی انتہائی قلیل تھی۔ بلکہ دفاعی لائن میں جگہ جگہ شگاف تھے جو اگر دشمن کو معلوم ہو جاتے تو وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رات کے وقت دس دس بارہ بارہ جوانوں کی لڑاکا گشتی پارٹیاں آگے جایا کرتی تھیں۔ ایک بار پاک فوج کے دو سپاہی قید ہو گئے کیونکہ وہ دشمن کے مورچوں کے علاقے میں گھس گئے تھے۔ اِدھر یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں دشمن کو کہیں یہ نہ بتا دیں کہ ہمارے اگلے مورچوں میں جو نفری ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ان مجاہدوں نے (بعد میں پتہ چلا کہ) غیر انسانی لرزہ انگیز اذیتیں برداشت کیں مگر ایک ہی جواب دیا — "ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا کچھ نہیں بتائیں گے"۔

لاہور سیکٹر میں دشمن پر ایک جوابی حملہ کیا گیا تھا۔ میں اس تاریخی جوابی حملے کی تفصیلات سالنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" اپریل ۱۹۶۶ء میں لکھ چکا ہوں۔ خاصی لمبی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھارتی کمانڈر آج بھی حیران ہیں کہ پاکستانیوں نے بی۔ آر۔ بی کس مقام سے اور کس طرح عبور کر کے یہ حملہ کیا تھا۔ نہر پر کوئی پُل سلامت نہیں تھا۔ اس حملے میں بھی ہمارے چند ایک جوان قید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے دشمن کو صرف یہ جواب دے کر کہ "ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا کچھ نہیں بتائیں گے" یہ راز فاش نہیں کیا تھا کہ یہ حملہ کس طرف سے کیا گیا تھا۔

کھیم کرن محور میں ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کے کرنل نذیر اور ان کے متعدد ٹینک سوار دشمن کے گھیرے میں آ گئے۔ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ایمونیشن بھی ختم اور سپلائی کے راستے بھی بند ہو گئے تو کرنل نذیر نے جوانوں کو بلا وجہ مروا دینے پر قید کو ترجیح دی۔ یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ جب ان سب کو بھارت کے ایک جنگی قیدی کیمپ میں لے جا کر پاک فوج کے متعلق پوچھا جانے لگا تو کرنل سے لے کر سپاہی تک نے ایک ہی جواب دیا — "ہم کچھ نہیں بتائیں گے" — اس سچ کی سزا کرنل نذیر کو بھگتنی پڑی۔ جب وہ جنگی قیدیوں کے تبادلے میں واپس آئے تو ان کی جسمانی اور دماغی حالت دگرگوں تھی کیونکہ انہیں

بھوکا بھی رکھا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں بھی دی گئیں۔ معلوم ہوا کہ بھارت کے اس قیدی کیمپ میں پاکستانی قیدیوں نے بھارتی افسروں کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ ایک سکھ میجر کہہ اٹھا ــــ "تم میدانِ جنگ میں بھی قابو میں نہیں آتے اور قید میں بھی تم قابو میں نہیں آرہے۔"

یہاں میں ایک اور سپاہی کا واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ بھارتیوں کی قید میں جاکر جہاں پاکستانی مجاہدوں کے لئے موت اور غیر انسانی اذیتوں کا خطرہ یقینی تھا وہاں انہوں نے نہ صرف عقل و ہوش کو ٹھکانے رکھا، بلکہ مزاج کی شگفتگی کو بھی برقرار رکھا۔ جسڑ کے پل سے آگے ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کا ایک ٹینک اس وقت کھڈ میں پہلو کے بل لڑھک گیا جب ایک خونریز معرکہ اپنی شدت پر تھا۔ اس صورتِ حال میں ٹینک سواروں کو اجازت ہوتی ہے کہ ٹینک کو چھوڑ کر پیچھے آجائیں۔ لیکن اس ٹینک کے غازی لڑھکے ہوئے ساکن ٹینک کی توپ سے مسلسل فائر کرتے رہے۔ گرد و غبار اور گولہ باری کے سیاہ دھوئیں میں یہ ٹینک کسی کو نظر نہ آسکا اور حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ دشمن نے ٹینک کو گھیر کر اس کے سواروں کو پکڑ لیا۔

انہیں پیچھے لے جاکر، ایک ہندو بریگیڈیئر ایک پاکستانی سپاہی سے نہ صرف اس کی یونٹ کے متعلق پوچھنے لگا بلکہ یہ بھی کہ ــــ "اس محاذ پر تمہاری کون کون سی اور کتنی ٹینک اور انفنٹری رجمنٹیں ہیں"۔ سپاہی نے اپنی یونٹ کا نمبر بتانے سے انکار کر دیا اور دوسری رجمنٹوں کے متعلق کہا کہ "مجھے معلوم نہیں" ــــ یہ حقیقت ہے کہ اسے دوسری یونٹوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا کیونکہ وہ اسی روز اس محاذ پر آیا تھا۔ ہندو بریگیڈیئر نے اس سے بار بار پوچھا کہ سیالکوٹ کے سارے محاذ پر پاکستان کا کون کون بریگیڈ ہے۔ اس سپاہی نے بریگیڈیئر سے کہا ــــ "جناب! میں آپ کے ان سوالوں کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن ایک کام کی بات بتا سکتا ہوں" ــــ بریگیڈیئر نے خوش ہو کر کہا ــــ "بولو، بولو، فوراً بتاؤ!"

ہمارے سپاہی نے کہا، "جناب آپ پاک آرمی کا ایک میجر جنرل پکڑ لیں۔ اسے ان ساری باتوں کا پتہ ہوگا" ــــ اس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ ہندو بریگیڈیئر اس مردِ مجاہد کی حاضر دماغی اور ان حالات میں مزاج کی شگفتگی کو برقرار رکھنے پر اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ قہقہے لگانے لگا، اور سپاہی سے پوچھ گچھ ختم کر دی۔

پاکستانی اور بھارتی سپاہی میں یہی تو بنیادی فرق ہے کہ پاکستانی سپاہی کا کردار بلند ہے اور بھارتی سپاہی ابرو باختہ ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو تسلیم کر لیں کہ پاکستانی سپاہی نے جہاد کے دوران جوش میں بھلے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستانی اور بھارتی سپاہی کے کردار میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ پاکستانی سپاہی بہتر قسم کا لٹھ باز ہے۔

میں جھوٹ کو واجب قرار دینے والے "علماء" سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ آپ "شریعت" کو اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھالتے چلے جایئے، آپ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ جہاں ہمارے ہاں ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے وہاں "شریعت" کیوں خالص رہے۔ لیکن خدارا اپنے دلائل میں پاک فوج کے سپاہی کو استعمال نہ کیجئے۔ ایسا کرنے سے آپ اُن شہیدوں کی مقدس روحوں کو بھی اذیت پہنچا رہے ہیں جو اسلام کی خاطر لڑتے لڑتے آپ کی "شریعت" کو بھی دشمن سے بچا گئے ورنہ آج آپ یہ فتویٰ بھی دے چکے ہوتے کہ ہندو مہاراج کو جھک کر سلام کرنا بھی واجب ہے۔ آپ کو اگر اس زمانے میں اتنی سی توفیق نصیب نہیں ہوئی تھی کہ بی آر بی سے دور کنارے پر کھڑے ہو کر میدان جنگ کو یونہی جھانک ہی آتے تو اب اپنے دامنِ تقدس کی حفاظت کے لئے ان شہیدوں اور غازیوں کی پاکبازیوں کو تو داغدار نہ کیجئے۔ جھوٹ وہ بولتا ہے جسے اپنے مفاد کی خاطر روباہ بازیوں پر اترنا پڑتا ہے ـــــ اور

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(نیز)

پرویز صاحب کے
درسِ قرآن کریم کا سلسلۂ نو

محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کا نیا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور اب

یہ درس

ہر اتوار کو ـــــ صبح ½۸ بجے

۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے

خواتین کے لئے پردہ کا خاص انتظام ہوگا ـــــ ناظم بزم طلوعِ اسلام لاہور

خورشید عالم

انڈونیشیا کا عالمی کردار

پچھلے شمارے میں یہ جائزہ لیا جا چکا ہے کہ کس طرح امریکہ عالمی سمندروں پر چھائے اور استعماری تزاقی کی نئی طرح ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ اب وہ اس سمندر میں بھی آن پہنچا ہے جس کے طوفان پاکستان ہی کو نہیں، ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ اس سمندر کے ایک طرف جنوبی افریقہ ہے جو بحر اوقیانوس سے آتے ہوئے راستے میں ہی نہیں پڑتا بلکہ آنے کا دروازہ بھی ہے۔ دوسری طرف آسٹریلیا ہے جو بحر الکاہل سے آتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔ دونوں ممالک سفید فام حکومتوں کے غاصبانہ قبضے میں ہیں لہٰذا استعمار مغرب کے خدا واسطے کے اڈے۔ امریکہ کو ان دونوں کی ضرورت بھی ہے اور ان کے کندھے بارِ استعمار اٹھانے کے لئے رضا کارانہ طور پر ہی نہیں غیر شعوری طور پر حاصل بھی ہیں۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے قاعدے پر جو استعماری تکون بنتی ہے اس کا اوپر کا کونہ بھارت ہے۔ بھارت کی نفسیات آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ سے مختلف تو ہے لیکن اس اس کے کندھے بھی امریکی استعمار کو غیر شعوری طور پر حاصل ہیں۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو عالمی سنگھاسن پر برہمن بن کے بیٹھا ہوا پاتا ہے۔ امریکہ اس کا کشتری ہے اور افریشیائی اقوام ایک حد تک ویش اور بہت حد تک شودر ہیں۔ اس کی کمر بارِ استعمارِ امریکہ سے ٹوٹی جا رہی ہے اور وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہے کہ امریکہ اس کا سنگھاسن اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہے۔ دوسروں کو فریب دینے اور اپنے بوجھ کا احساس کم کرنے کیلئے اس نے روس کو بلا لیا ہے، اپنے ہاں بھی اور کھلے سمندر میں بھی۔ بھارتی خرِ استعمار کی اس کوشش بیہودہ سے اس کا احساسِ بار نہ کم ہو سکتا ہے نہ ہوگا البتہ عالمِ افریقہ و ایشیا کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ مشکلات مشیت کی للکار بھی ہیں اور نوید بھی۔ فرعونِ استعمار بھاگا بھاگا سمندر تک آ پہنچا ہے۔ اس کی غرقابی وقت کی بات ہے۔

آسٹریلیا، بھارت اور جنوبی افریقہ کی تکون کو نقشے پر دیکھا جائے تو نظر لامحالہ انڈونیشیا پر پڑے گی۔

یہ اس کی بحری اہمیت کی دلیل ہے۔ آسٹریلیا اور ایشیا کے درمیان انڈونیشیا راستہ روکے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر دوسری جنگِ عظیم کے بعد انڈونیشیا کے قابض یورپی ملک ہالینڈ اور بزعم خود سرخیلِ استعمار برطانیہ نے بڑی ڈھٹائی سے اسے اپنے تصرف میں رکھنا چاہا، لیکن انڈونیشیا کے مجاہدینِ حریت جو جنگ سے پہلے ہالینڈ کے خلاف سینہ سپر رہے، اور جنگ کے دوران جاپانی قبضے میں چلے جانے کے باوجود اپنا تشخص قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں کامیاب رہے، وہ کسی قوم کے غلام رہ سکتے تھے نہ رہے۔ انڈونیشیا نے استعماری جنگ بھی دیکھی اور عالمگیر جنگ بھی، دونوں سے اس کی معیشت اور معاشرت بُری طرح متاثر ہوئی، یہاں تک کہ آج تک اس کی اصلاح کی مناسب صورت پیدا نہیں ہوئی گو کوئی ایسا لائحہ عمل نہ ابھر سکا جو اندرونِ ملک اصلاحِ احوال کی طرح ڈالتا اور داخلی سیاسی انقلاب سے متمتع ہونے کی ضمانت بنتا جو غیر ملکی غلامی کے خاتمے سے نمودار ہوا تھا تاہم انڈونیشیا کی خارجہ حکمتِ عملی شروع سے ہی بڑی معقول اور جرأت مندانہ رہی۔ جب ہالینڈ نے واضح معاہدے کے باوجود مغربی ایرین کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے پہلو تہی شروع کر دی تو حکومت انڈونیشیا نے اقوامِ متحدہ سے رجوع کیا۔ اس کا خاص امکان تھا کہ مغربی ایرین دوسرا کشمیر بن جائے گا اور اقوامِ متحدہ ایک یورپی قوم کے خلاف نہ فیصلہ دینا چاہے گی نہ دے سکے گی۔ انڈونیشیا اس مثال سے ہراساں نہ ہوا اور کمالِ تدبر سے مغربی ایرین حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح انڈونیشیا نے پاکستان کو عملاً دکھا دیا تھا کہ اغراض و مصالح کی دنیا میں اپنی مطلب براری کیسے ہو سکتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہالینڈ سے اپنا علاقہ حاصل کرنے کے لئے انڈونیشیا نے اقوامِ متحدہ کی وساطت سے پاکستان ہی کی فوجی نگرانی قبول کی۔ انڈونیشیا نے پاکستان پر جس برادرانہ اعتماد کا مظاہرہ کیا اور پاکستان نے جس خلوص سے اس اعتماد کو نبھایا، اس سے ان دو بڑے مسلمان ایشیائی ممالک میں تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔

انڈونیشیا کو استعمار سے جس طرح کا واسطہ پڑا، اس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ چنانچہ اس ملک کی خارجہ پالیسی شروع ہی سے غیر جانبدارانہ رہی۔ غیر جانبداری کے تصور کو بھارت جیسے منافق نے خوب رسوا کیا۔ اس پردے میں اس نے کھلی جانبداری کا مظاہرہ کیا اور کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ یہ تصور ایک مذاق بن گیا۔ لیکن انڈونیشیا نے قول و فعل میں اس کا لحاظ رکھا اور اس کا بھرم قائم رکھا۔ اس سے بجا طور پر اس کا اپنا وقار اور احترام بین الاقوامی میدان میں بڑھتا چلا گیا۔ اس قدرِ مشترک نے ابتداءً اسے بھارت کے قریب کر دیا۔ بھارت کے قریب وہ اور اس لئے بھی ہو گیا کہ غیر جانبدار ہونے سے اس کے تعلقات روسی بلاک سے استوار تھے۔ لیکن چونکہ عالمی سطح پر اس کی ذاتی غرض کوئی نہیں تھی اس لئے اس نے اجتماعی مفاد کو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا اور افریشیائی تصورِ تعاون و اشتراک کا مخلص اور سرگرم داعی بن گیا۔ کوئی چودہ سال پیشتر اس نے ایک افریشیائی مؤتمر کی تجویز پیش کی اور

۱۹۵۵ء میں اسے اپنے وطن بندونگ کے مقام پر منعقد کر کے دکھا دیا۔ گو اس اجتماع کو چنداں وقیع نہ سمجھا گیا اور اکثر کا رائے کا اظہار کیا گیا کہ یہ بھان متی کا کنبہ ایک بار اتفاق سے جڑ گیا ہے تو پھر نہ جڑ سکے گا اور نہ اسے جوڑنے کی کوئی زحمت ہی مول لے گا۔ لیکن یہ تصور دیکھتے دیکھتے ایک تحریک بن گیا اور بندونگ۔ افریشیائی ممالک کے باہمی تعاون و تعامل کی علامت بن گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں جب دوسری " بندونگ " کانفرنس کا انعقاد الجزائر میں عمل میں لایا جانے لگا تو برہمنی استعمار کے نمائندے اور امریکی استعمار کے کارندے بھارت نے بڑے جتن کئے کہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکے۔ اس نے غیر جانبداروں کی کانفرنس کا ڈھونگ رچانے کی کوشش کی تاکہ پاکستان اور چین اس میں شرکت نہ کر سکیں اور انڈونیشیا ان سے علیحدہ ہو جائے۔ وہ ناکام ہوا تو دوسری تاریخ پر سازش ہوئی اور کانفرنس منعقد ہوتے ہوتے رہ گئی۔

بات یہیں ختم نہیں ہونے دی گئی، پے درپے واقعات سے افریشیائی ممالک میں پھوٹ ڈلوانے اور ایک دوسرے سے الجھانے کی ایسی کوششیں کی گئیں کہ وہ مل کے بیٹھنا تو الگ بات ہے، مل بیٹھنے کی سوچ بھی نہ سکیں۔ اس کے لئے بھارت اور اسرائیل خاص طور پر کام آئے۔ ایک نے پاکستان پر بھرپور وار کیا تو دوسرا عربوں پر چڑھ دوڑا۔ پھر خود انڈونیشیا میں انقلاب قیادت آیا۔ اس کے محرکات اپنی جگہ، اس بظاہر اندرونی سیاسی تبدیلی سے انڈونیشیا اور چین کے درمیان اختلافات کی خلیج ابھار کے اسے ناقابلِ عبور بنا دینے کی کوششیں ہوئیں۔ اس سے اور شاخسانے بھی نکلے۔ نیپال، برما وغیرہ ایشیائی ممالک کو بھی چین کے روبرو کرنے کے سامان ہونے لگے۔ اب صورت یہ ہے کہ عرب اسرائیلی جارحیت سے پریشان ہو کر تحفظِ خویش کے محدود تصور میں الجھ گئے ہیں۔ وسیع تر افریشیائی اشتراک ان کے لئے کسی اور زمانے کا خواب لگتا ہے۔ ان میں سے بعض کے لئے ایک اور مسئلہ پیدا کیا جا رہا ہے — خالصتاً جذباتی اور اصلاً بے معنی — جو خلیج فارس کے نام سے منسوب چلی آ رہی ہے وہ ان کے نزدیک عربیت سے منسوب ہونی چاہیئے۔ انہوں نے اسے عربی خلیج کہنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ایران 'فارس' سے نسبت کو قومی وقار کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ جوں جوں برطانیہ کے انخلاء کے سامان ہوتے جائیں گے یہ برائے نام مسئلہ عرب وعجم کی خارجہ حکمتِ عملی کا ایک نازک مسئلہ بنتا جائے گا۔ انڈونیشیا اپنے طور پر بھی پریشان ہے اور اس کے چین کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ختم ہو چکے ہیں۔ گویا وہ اندرونی طور پر وسیع تر بین الاقوامی اتحاد کی بات کرنے کے قابل بھی ہو جائے تو چین سے انقطاعِ تعلق کی بنا پر اس کے لئے کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکتا۔ سب سے زیادہ گھناؤنا کھیل بھارت کھیل رہا ہے اس نے چین کے خلاف نفرت کا نیا ہمالیہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس ہمالیہ کو اور اونچا کرنے کے لئے وہ سمندروں میں امریکہ اور روس دونوں کو بلا لایا ہے۔ دوسری بندونگ کانفرنس میں وہ روس کی شرکت کے لئے کوشاں رہا کہ اول تو کانفرنس منعقد نہ ہو سکے اور ہو تو روس اور چین ایسے ایک دوسرے کے روبرو ہو جائیں کہ کانفرنس نتیجہ خیز نہ ہو سکے۔

اب اسے افریشیائی سمندروں میں لاکر بھارت نے روس کو افریشیائی طاقت بنا دیا ہے۔ گویا اب بندونگ کانفرنس کی بات تو بات ہی نہیں ہوگی اور ہوگی تو روس کو شریک کئے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ روس شریک ہوا تو کانفرنس کا نقشہ اور نتیجہ وہ نہیں ہوگا جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

نظر بہ ظاہر افریشیائی صورت حال ایسی الجھا دی گئی ہے کہ دوسری بندونگ کانفرنس کے انعقاد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر منعقدہ اور مجوزہ بندونگ کانفرنسوں کے درمیانی عشرے میں حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جاتا۔ اور حالات جن جرأت مندانہ اقدامات کے متقاضی تھے، ان سے گریز نہ کیا جاتا تو افریشیائی سیاست کا جو بظاہر مایوس کن عالم آج ہے وہ ہرگز نہ ہوتا۔ انڈونیشیا نے اس دوران دو رس اقدامات کئے لیکن اسے ہمسایوں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ اس تائید کی سب سے زیادہ ذمہ داری پاکستان پر عاید ہوتی تھی۔ حالات نے پاکستان کو تائید کا موقع بھی مہیا کیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی باتیں بھی ہوئیں مگر بات باتوں تک ختم ہو کے رہ گئی۔ انڈونیشیا واحد ملک ہے جس نے بحرِ ہند کے نام میں مضمر فتنے کو بھانپا۔ اس نے اپنے طور پر یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ سرکاری طور پر اس بحر کو "بحرِ انڈونیشیا" کہے گا۔ اس کا یہ فیصلہ اور اعلان ایک بحری بندونگ کانفرنس کا پیش خیمہ ہونا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ نام بدلنے میں پہل پاکستان کو کرنی چاہیئے تھی۔ برصغیر کو پاکستان اور بھارت میں تقسیم کر کے اس نے اس بحر کو بحرِ ہند نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ سوال اٹھانا تو در کنار، انڈونیشیا نے اپنی طرف سے پہل کر دی تو پاکستان کو اس کی تائید تک کی توفیق نہ ہوئی۔ اس سے بہت پہلے پاکستان اس حد تک مداہنت سے کام لے چکا تھا کہ بعض پاکستانی اخبارات نے "ہند" کو بھارت کہنے کا فیصلہ کیا تو بھارتی احتجاج یا درخواست پر اسے چلنے نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ اپنے آئین کی رو سے وہ ملک اپنے آپ کو "انڈیا یعنی بھارت" کہتا ہے۔ یہ بحث ان صفحات پر کی جا چکی ہے کہ انڈیا، بھارت بن جائے تو اس ملک کی فتنہ انگیزی کہیں کم ہو سکتی ہے جو اس نے مغربی پاکستان کے قدیم نام کو دیدہ دلیرانہ اپنا کر برپا کر رکھی ہے۔

انڈونیشیا نے پاکستان کو ایک اور ایسا ہی موقع ۱۹۶۵ء میں مہیا کیا۔ وہ اقوامِ متحدہ کو خیرباد کہہ کے آ گیا تھا۔ اقوامِ متحدہ نے کشمیر کے معاملے میں جو زیادتی اور ناانصافی روا رکھی وہ کسی بھی خوددار اور جسور قوم کے لئے ایسی محفل سے اٹھ آنے کا معقول بہانہ بن چکی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان نے بجا طور پر یہ شرط لگانے کی کوشش کی کہ اگر اقوامِ متحدہ تین ماہ کے اندر اندر کشمیر کے تصفیہ کے لئے مطلوبہ اقدامات نہ کرے تو پاکستان اسے چھوڑ دے گا۔ اس تصور سے اقوامِ متحدہ پر لرزہ طاری ہو گیا اور یہ ہیت کا محل زمیں بوس ہوتا دکھائی دینے لگا۔ چین اقوامِ متحدہ سے باہر تھا۔ انڈونیشیا نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اگر پاکستان اقوامِ متحدہ کو خیرباد کہہ دیتا تو یہ سلسلہ بہت دور جا پہنچتا۔ اس کے علاوہ، عالمِ مشرق کی ایک ایسی اقوامِ متحدہ معرضِ وجود میں آ سکتی تھی جو موجودہ اقوامِ متحدہ کے رسمی خاتمے کا فوری سبب

نہ بھی بنتی تو اسے بے کار اور غیر مؤثر ضرور بنا کے رکھ دیتی اور عالمی سیاست میں امریکی بالادستی ختم ہونے کے یقینی آثار پیدا ہونے شروع ہو جاتے۔ جنگِ ستمبر میں پاکستان نے جس بے نظیر جرأت اور عزیمت کا مظاہرہ کیا اس نے بھارت کی عظمت کی قلعی کھول دی اور پاکستان کو دولتِ عظمیٰ کا کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس کردار کے تقاضے سمجھے اور پورے کئے جاتے تو وہ سازش کبھی کامیاب نہ ہوتی جو الجزائر سے انڈونیشیا تک افریشیائی برادری کو بے چارہ بنانے کے لئے پہلو بدل بدل کے کی گئی۔ اس کا خمیازہ پاکستان کو بھی بھگتنا پڑ رہا ہے اور انڈونیشیا کو بھی۔ سمندر کی موجودہ صورتِ حال اسی خمیازے کی سنگین شکل ہے۔

بار بار کے مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو دشمنوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔ انڈونیشیا میں ایک طوفان اُمڈ آیا اور سوئیکارنو کو بے دست و پا کرنے کے لئے اقدامات ہونے لگے۔ اس طرح جو تبدیلی انڈونیشیا میں آئی یا لائی گئی، اس نے داخلی نظمِ سیاسی کی کمزوری کو اور ابھار دیا ہے۔ یہ کمزوری انڈونیشیا کی مخصوص کمزوری نہیں نوآزاد ممالک کی مشترکہ کمزوری ہے۔ جملہ ممالک محروسہ جس مجاہدانہ جدوجہد کے بعد آزادی سے ہمکنار ہوئے وہ ایمان افروز داستان ہے۔ لیکن تمام کا تقریباً ایک جیسا المیہ ہے کہ جو قیادت محاذِ جنگ میں حریت اور ایثار کا پیکر تھی وہ آزادی کے بعد ملک کی حکمران بن کے بیٹھ گئی اور جمہور کے اپنے آپ میں آنے اور خود اعتمادی سے تدبیرِ امور کرنے میں مزاحم ہونے لگی۔ نوآزاد ممالک ابھی تک کوئی ایسا نظمِ سیاسی متشکل کرنے میں ناکام رہے ہیں جو جمہور کی اجتماعی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اور مسائل قومی کو خود امدادی اور تعاون باہمی سے حل کرنے کے سامان پیدا کرنے کا ضامن ہو سکے۔ اس کا نتیجہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال لہٰذا افراتفری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ آزادی کے جلو میں جو صنعتی ترقی ہوئی اس نے اس سرگونہ استحصال کو اور متشدد کر دیا۔ جس استحصال کا ہو جائے تو چند افراد اقتدار اور ذرائع پیداوار پر مسلط ہو کر پورے معاشرے کو مفلوک الحال بنا دیتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں سیاسی تبدیلیاں تنومندی اور توانائی پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ اصلاحِ ہمہ گیر انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن سیاسی استحکام کو اصل مقصد سمجھ لیا جاتا ہے، جس سے طاقت کا سرچشمہ افراد کی ذات بن جاتی ہے اور جمہور محروم اقتدار ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال سیاسی بدنظمی پیدا کرتی ہے اور طرح طرح کے مفاسد کو فروغ دیتی ہے۔ انڈونیشیا سوئیکارنو ایسے قائد کو معزول کرنے میں تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن جمہور کو شریکِ قلم کر کے انہیں انقلاب آشنا کرنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ایک کے آنے اور دوسرے کے جانے سے ایسے آثار پیدا بھی نہیں ہو سکتے۔ البتہ اس اندرونی صورتِ حال کا ناجائز فائدہ بیرونی قوتیں اٹھا جاتی ہیں اور وہ خارجہ پالیسی کو بے جان اور بے اثر بنا دیتی ہیں۔ بیرونی قوتیں اس صورت کا فائدہ اٹھاتی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خارجہ پالیسی اندرونی صورتِ حال ہی کا عکس ہوتی ہے۔ جب تک انڈونیشی قوم کو اپنے قائد پر اعتماد تھا اس نے ملیشیا میں استعماری سرگرمیوں

میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہیں ہونے دیا۔ تو آزاد اقوام کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور علاقائی یا بین الاقوامی سطح پر تعاون کر کے اس ورثۂ کمزوری کا ازالہ کرنے کی تدبیریں کرنی چاہئیں۔ نہیں تو وہ ظاہری ترقی کے باوجود بے چارہ بھی رہیں گی اور بیرونی قوتوں کی سازشوں کا شکار بھی۔

پاکستان اور انڈونیشیا میں باہمی تعاون کی ضرورت بھی اشد ہے اور اس کا امکان بھی بہت ہے۔ انڈونیشیا قدرتی طور پر مثالی ملک ہے۔ تصوراتی طور پر مسلمان ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے بحری طاقت بھی ہے اور پاکستان کا ہمسایہ بھی۔ پاکستان کے قیام سے جہاں عالم اسلام کی حدود مغرب میں واہگہ تک پہنچ گئی ہیں وہاں مشرق میں انڈونیشیا سے مل گئی ہیں۔ انڈونیشیا کا جزیرہ سماٹرا خلیج بنگال تک آ پہنچا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قدرت نے دونوں کو حلیف بنایا ہے۔ اپنے داخلی خلفشار کے باوجود ہمارے اس صاف نظر اور جری ہمسائے نے سیدھی اور نکھری خارجہ حکمت عملی اپنا رکھی ہے۔ اپنے علاقے میں اس نے استعمار کا راستہ بڑی پامردی سے روکا ہے۔ انڈونیشیا نے ملیشیا سے اس وقت ٹکر لی جب ملیشیا کے اتحاد کو بالعموم ہمدردی سے دیکھا جاتا تھا۔ انڈونیشیا کو اعتراض اس اتحاد پر نہیں تھا بلکہ اس اتحاد کے استعماری سرگرمیوں کا مرکز بننے پر تھا۔ اس اتحاد میں خرابی کی کیا صورتیں پنہاں تھیں اس کا اندازہ پاکستان کو جنگ ستمبر میں ہوا جب پتہ چلا کہ اقوام متحدہ میں ملیشیا کا نمائندہ ایک بھارتی ہندو ہے جو بھارت کی طرفداری اظہار خیال کے لئے حکومت کی ہدایت کا محتاج نہیں بلکہ اپنے خبث باطن کا مظاہرہ ضروری سمجھتا ہے۔ اس مظاہرے کے بعد پاکستان نے ملیشیا سے سفارتی تعلقات منقطع کر کے عملاً اعتراف کیا کہ انڈونیشیا کی سیاسی پیش بینی کس قدر قابل اعتماد تھی۔ اگر بروقت انڈونیشیا کا ساتھ دیا جاتا تو آج استعماری فتنہ اس قدر سرکش نہ ہو جاتا جتنا کہ ہو چکا ہے اور اگر ہو بھی جاتا تو اس کے خلاف پہلے سے ایک فضا قائم ہوتی۔

اب ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی کا وقت آ گیا ہے۔ بھارت سمندروں میں جو گل کھلانے لگا ہے اس نے پاکستان اور انڈونیشیا کا اتحاد ناگزیر بنا دیا ہے۔ سمندر جولانگاہ ہو سکتی ہے تو پاکستان اور انڈونیشیا جیسے ممالک کی جو محل وقوع اور تاریخ کے اعتبار سے جہاز راں چلے آ رہے ہیں۔ بھارت کبھی سمندری طاقت نہ تھا۔ کوہستہ کے اُس پار بکھرے ہوئے حدود بھارت کو سمندر کا خیال آتا تھا تو یوں کہ اس کا سفر پاپ ہے۔ پاکستان کے پیدائشی ملاحوں کو وہ گالیاں دیا کرتا تھا۔ وہ گالیاں اب بھی دے رہا ہے لیکن امریکہ اور روس کی کشتیوں میں سوار سمندر میں آتا جا رہا ہے۔ وہ سمجھتا یہ ہے کہ ان دو کشتیوں میں سواری کرتے کرتے اپنی علیحدہ کشتی بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور جس سمندر تک پہنچنے سے وہ بھرشٹ ہو جایا کرتا تھا اسے اپنی بازی گاہ بنا کر ان ملاحوں کا ناطقہ بند کرے گا جنہیں وہ گھر بیٹھے بیٹھے صدیوں سے گالیاں دیتا چلا آیا اور کچھ بگاڑ نہیں سکا تھا۔ پاکستان جس برہمنیت کے خلاف کم و بیش بارہ سو سال سے برسر پیکار ہے اس کا نیا محاذ سمندر میں تیار ہو رہا ہے۔ اس محاذ پر انڈونیشیا

پہلے سے موجود ہے۔ وہ اندرونی اور بیرونی مشکلات کے باوجود اپنی لڑائی لڑتا چلا آرہا ہے۔ وہ پاکستان کا مخلص اور بہادر ساتھی ہے اور اس سے دوش بدوش ہونے کے لئے تیار ہی نہیں دوش بدوش ہو بھی چکا ہے۔ جنگ ستمبر میں انڈونیشیا نے جس طرح پاکستان کا ساتھ دیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں انڈونیشیا نے ایسا نعرہ لگایا تھا جو درحقیقت پاکستان کے سینے سے اٹھنا چاہیئے تھا۔ نعرہ تھا۔ "گنجنگ انڈیا" — یعنی انڈیا کو کچل دو۔ یہ نعرہ لگاتے ہوئے انڈونیشیا کے سامنے وہ انڈیا تھا جو امریکی استعمار کا کارندہ بن گیا تھا۔ ایسے انڈیا کو کچل ہی دینا چاہیئے۔ اس مہم میں پاکستان اور انڈونیشیا کندھے سے کندھا بھی ملا سکتے ہیں بلکہ ملائے ہوئے بھی ہیں اور افریقہ اور ایشیا کے لئے اشتراک و تعاون کا ایک نیا میدان بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں ایک معاشی تعاون کے معاہدے پر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ اس تعاون کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے اور بنایا جانا چاہیئے۔ اسے بطور خاص پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ مجمع الجزائر ہونے کی وجہ سے انڈونیشیا نے اپنی بحری حیثیت کو شروع سے نگاہ میں رکھا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بحری قوت بننے میں کوشاں رہا ہے۔ وہ عظیم بحری بیڑے کا مالک ہے۔ پاکستان اس کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کا رفیق بحر بن سکتا ہے۔ جہازرانی اور جہاز سازی میں پاکستان بھی اپنی حیثیت بنا تا جا رہا ہے اس کا فائدہ دونوں ملکوں کو پہنچ سکتا ہے اور ان کی وساطت سے افریشیائی برادری کو۔ تقاضائے وقت، بقول اقبال یہی ہے —

زہند و صید نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورق ما روشناس دریا نیست

———— (ختم) ————

انٹرمیڈیٹ (پری میڈیکل) کے سٹوڈنٹس کے لئے
پروفیسر وہاب اختر عزیز کی تصنیف
نباتیات (BOTANY)

[ناشرین] نباتیات، حصہ اوّل : مکتبہ کائنات۔ سوہا بازار۔ لاہور ۲
نباتیات، حصہ دوم : ایم جہانگیر اینڈ کمپنی۔ اردو بازار۔ لاہور ۲

حقائق و عبر

۱۔ جمہوریت یا مذاق

بمبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کی ۱۴ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت کا افتتاحیہ (جو مندرجہ بالا عنوان سے شائع ہوا ہے) قابل ملاحظہ ہے۔ لکھا ہے۔

کل تک ہم اپنے ملک میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی تعریف کیا کرتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے..... اور آج جمہوریت اور پارلیمانی طریقہ کار کو "مذاق" سمجھنے لگے ہیں.....!

کیا ہندوستان کا جمہوری نظام فی الحقیقت ایک بڑا مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ گورنروں اور اسپیکروں کے اختیارات کا جھگڑا، ایک پارٹی سے نکل کر بلا تکلف دوسری پارٹی میں شمولیت اور چھوٹے چھوٹے گروپوں کی جانب سے وزارتوں کے لالچ میں اکثریت کی حکومتوں کو ختم کرنے کی کارروائیاں اگر جمہوری نظام کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔

کہیں بھی دس پندرہ اراکین مل کر بغاوت کا علم بلند کر دیتے ہیں اور پھر ان کی آؤ بھگت شروع ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس کاروبار کی حوصلہ افزائی سب ہی پارٹیاں کر رہی ہیں۔ اراکین کی "سودے بازی" سے کانگریس یا اس کی تائید سے قائم ہونے والی حکومت ختم ہوتی ہے تو کانگریس کیمپ خوشیاں منانے لگتا ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ خوشیاں ہم پارلیمانی نظام کی ناکامی پر مناتے ہیں اور اس طرح ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی سب سے بڑی قبر کھود رہے ہیں۔

اس کے بعد اس "جمہوری تماشہ" کی ناکامی کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

بائیں کانگریسیوں کا کہنا ہے کہ وہ اصولی طور پر اقلیت کی حکومت قائم کرنے کے خلاف تھے..... لیکن کیا اپوزیشن سے گٹھ جوڑ کر لینا بھی اصولی بات ہے۔

ملک کے موجودہ حالات میں اصولوں کی بات کرنا ہی مضحکہ خیز ہے۔ اصول اور اخلاق تو سیاسی دنیا میں اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں اور جو ان کی بات کرتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ جب کانگریس نے مسٹر منڈل کی حمایت کی تھی، اس وقت بھی اس نے کوئی اصولی بات نہیں کی تھی اور اب باغی کانگریسیوں نے منڈل حکومت کے خاتمے میں مدد دے کر بھی کسی اصول کا جھنڈا بلند نہیں کیا ہے۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جمہوریت کہیں بھی ہو، اگر وہ غیر متبدل اقدار سے بے نیاز ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں وہی نظامِ حکومت کامیاب ہو سکے گا جو خدا کی عطا کردہ اقدار کی چہار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کارفرما ہو۔ اور یہ اقدار قرآن کے علاوہ اور کہاں مل سکتی ہیں؟

(۰)

۲۔ حدیث کے پرکھنے کا معیار

۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کے اخبار ایشیا میں، کراچی میں امیر جماعت اسلامی (مودودی صاحب) کی ایک پریس کانفرنس کی روئیداد شائع ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں تحریر ہے۔

ایک صاحب نے ایک موضوع حدیث کے متعلق ایک سوال کیا۔

مولانا نے فرمایا:۔

جس طرح حدیث کا نہ ماننا گناہ ہے اسی طرح ایک بے تحقیق بات کا حضورؐ کی جانب منسوب کرنا بھی گناہ ہے۔

اس پر ایک مغربی تعلیم یافتہ صاحب نے کہا۔ لیکن مولانا ہم کیسے تحقیق کر سکتے ہیں کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہے؟

مولانا نے فرمایا:۔

ایک آدمی حق و ناحق کی بخوبی پہچان کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ذہن میں اسی بات کو اہمیت دے کہ اسے اپنی عاقبت سنوارنی ہے۔ جب فکر ہوگی تو حق و ناحق کا امتیاز بھی واضح ہو جائیگا۔

مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی عاقبت سنوارنے کی اہمیت کا احساس ہو تو اسے اس بات کے پرکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی کہ کون سی حدیث موضوع ہے اور کونسی سچی۔ یہاں سے ایک چھوٹا سا سوال اُبھرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ جو حدیث کے ماننے والوں میں ہزار برس سے یہ بھی طے نہیں ہو سکا کہ (مثلاً) الحمد کے بعد آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا خاموشی سے، تو کیا مودودی صاحب کے خیال میں ان کروڑہا کروڑ حضرات میں سے کسی کو بھی (معاذ اللہ) اپنی عاقبت سنوارنے کا خیال نہیں تھا؟ اور کیا آج بھی جو آئے دن ان مسائل پر از روئے احادیث مناظرے ہوتے رہتے ہیں، تو ان میں سے بھی کسی کو بھی اس کا خیال نہیں کہ اس نے اپنی عاقبت سنوارنی ہے؟ اگر انہیں خیال ہے تو پھر ان پر حقیقت کیوں نہیں منکشف ہو جاتی!

آگے چل کر تحریر ہے:۔

اپنی صاحب نے پھر مولانا سے عرض کیا۔ مولانا! اس نکتہ کی ذرا مزید وضاحت فرما دیجیئے گا۔

مولانا نے فرمایا:

آپ قرآن کو باقاعدگی سے پڑھیئے اور اس کے نوٹ لیتے جایئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل دین کیا ہے اور مدار نجات کن چیزوں پر ہے۔ دین جاننے کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پاؤں، رکوع یا جتنا بھی قرآن پڑھیں خوب سوچ سمجھ کر پڑھیئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء کس لئے آئے تھے؟ آدمی کو کیا اختیار کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔

یعنی اگر کوئی شخص قرآن مجید کو سمجھ سوچ کر پڑھے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ دین کیا ہے اور مدار نجات کن باتوں پر ہے۔ اس کے بعد دین جاننے کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

لیکن یہی بات آپ کا کوئی مخالف کہے تو اسے آپ منکر حدیث اور منکر رسالت قرار دے دیتے ہیں!

۳۔ قربانی کیوں واجب ہے؟

ہفت روزہ ایشیا کی ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں یہ خبر درج ہوئی ہے کہ:

جماعت اسلامی کراچی کو امسال عید الاضحیٰ کے موقع پر سولہ ہزار دو سو کھالیں فراہم ہوئیں اور لاہور کے کارکنوں نے ۲۴۹۸ کھالیں جمع کیں جو ۳۱۲۵۰/۳۶ روپے میں فروخت ہوئیں۔

اس حساب سے صرف کراچی اور لاہور کے دو شہروں سے جماعت اسلامی کو (قربانی کی کھالوں سے) ــــ

سوا دو لاکھ روپیہ سے زاید کی آمدنی ہوئی۔ پاکستان کے باقی علاقوں سے کس قدر یافت ہوئی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی جماعتِ اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے 'قربانی کے وجوب' میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے؟ اب رہا یہ کہ جن بکروں کی کھالوں کی قیمت سوا دو لاکھ روپے سے زاید تھی، خود ان بکروں کی قیمت کیا تھی، اس سے اس جماعت (یا دوسرے کھالیں لینے والوں) کو کیا واسطہ؟

۴۔ اعضاء کی تقلیم کا مسئلہ

آج کل دنیا کے "ملحدوں اور دہریوں" نے بعد از کاوش و تحقیق بسیار، اس امر کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ مُردے کے اہم اعضا (جو انسان کی موت کے بعد گل سڑ جاتے ہیں) انہیں زندہ انسانوں کے جسم میں پیوست کر کے، خلقِ خدا کو اس سے فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن 'خدا پرست' ان کے خلاف لٹھ لے کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ 'از روئے شریعتِ حقہ' یہ عمل یکسر ناجائز ہے۔ (جس طرح اس سے پہلے لاؤڈ سپیکر کا استعمال از روئے شریعت حرام تھا اور آج کوئی مسجد ایسی نہیں جس میں لاؤڈ اسپیکر نصب نہ ہو) اس کے حق میں دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان ایشیا کی ۴ ہر مارچ کی اشاعت میں، ملک غلام علی صاحب، معاون امیر جماعتِ اسلامی، کے قلم سے ایک سوال کے جواب میں مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔[1]

> اس بارے میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اسلام نے میت کی تکفین و تدفین کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مُردے کی تکریم اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندہ کی۔

یہ ہوا، ان کے نزدیک، اسلام کا حکم۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

> یہ واضح احکام بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم نے زندوں کے نفع کے لئے مُردوں کے اعضا کی قطع و بُرید کا دروازہ کھول دیا، تو پھر اس میں کوئی انتہا نہ رہے گی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک وقت آئے جب مُردے کے تمام اعضائے رئیسہ زندہ جسم میں تقلیم کئے جا سکیں۔ پھر اس وقت اس کی

---

[1] واضح رہے کہ ملک غلام علی صاحب کا جواب مبنی ہے خود مودودی صاحب کے اس مضمون پر جسے انہوں نے رسائل و مسائل حصہ سوم (صفحہ ۲۹۷) پر شائع کیا تھا۔ اگرچہ ملک صاحب نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔

حد بندی مشکل ہو جائے گی کہ کس عضو کو مُردے کے جسم پر باقی چھوڑا جائے اور کس کو کاٹ لیا جائے۔ بالکل ممکن ہے کہ مُردے کی بوٹی بوٹی ہاتھوں ہاتھ اُڑا لی جائے۔ اگر مُردے کی آنکھ کسی زندہ کی بینائی کی بحالی کے لئے درکار ہوگی تو اس کا دل، اس کا پتہ، اس کا جگر، اس کے گُردے اور دیگر اعضاء کیوں قابلِ استعمال نہ ہوں گے۔ اور ان سے سرجری کی وساطت سے کسی کی جان کیوں نہ بچائی جاسکے گی۔ اس کے بعد کون سی حد ہوگی، جہاں آدمی رُک کر یہ کہہ سکے گا کہ مُردے کے ان اعضاء سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور مُردے کہاں باقی رہ جائیں گے کہ ان کے احترام کے لئے ہدایات کی ضرورت ہو؟ ایسے مسائل میں جواز کے دروازے کھولنا درحقیقت فتنوں کے طوفان کے لئے راہ بنانا ہے۔ اس لئے میری رائے میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ یہ عمل اسلام کے کسی اصول کے مطابق مستحسن و پسندیدہ ہے۔

یعنی اگر کسی مُردے کی آنکھوں سے ایک زندہ نابینا کو عمر بھر کے لئے بینائی مل سکتی ہے، تو اسے اس بینائی سے محروم رکھیئے۔ (اسے اندھے کا اندھا رہنے دیجئے) کیونکہ اسے بینائی عطا کرنے سے "مُردے کی بے حرمتی" ہوتی ہے اور یہ چیز اسلام کے خلاف ہے! یعنی اگر اندھے کو آنکھیں مل جائیں، تو یہ اسلام کے خلاف ہوگا۔ اور مُردے کی آنکھیں گل سڑ کر بیکار چلی جائیں تو یہ عین مطابق اسلام ہوگا! ہم اس سلسلہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا اسلام کو اس کے ان دوستوں سے بچائے۔

(۔۔۔)

یومِ اقبالؒ

۲۱ر اپریل ۱۹۶۸ء کو بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے حسبِ دستور یومِ اقبالؒ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں بوقت ۳½ بجے شام منایا جا رہا ہے

محترم چودھری صاحب کے خطاب کا موضوع ہے ۔۔۔ "مقامِ آدم" ۔۔۔ چونکہ یہ پرچہ اس سے قبل پریس میں جا رہا ہے، اس لئے ہمیں افسوس ہے کہ اس تقریب کی رودادا اس میں شائع نہیں کی جاسکی۔

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور

نقد و نظر

۱۔ "محشرِ فلسطین"

مصنف : میجر جنرل محمد اکبر خان اور خورشید عالم۔

قیمت : -/۵ روپے

ناشر : مکتبہ داستان۔ نمبر ۴ شارع فاطمہ جناح۔ لاہور

فلسطین ہماری تاریخ و سیاست کا نازک ترین مسئلہ ہے اس لئے اس کے ساتھ جذباتی وابستگی قابلِ فہم بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ لیکن جون ۱۹۶۷ء میں جو قیامت آئی (اور نہ جانے یہ قیامت کب تک رہے گی) اس میں ان جذبات کا مظاہرہ افسوسناک بھی ہوا، شرمناک بھی۔ خیر سے ان جذبات کے اظہار کی ذمہ دار جماعت اسلامی بن گئی۔ جلسے اخبارات نے بالعموم اسی جماعت کے پیش کردہ مواد پر تکیہ کیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ مواد عرب اور اسلام دشمن ذرائع کی طرف سے مہیا کیا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ پھیلانے والوں نے اسے خوب پھیلایا۔

اس غیر ذمہ دارانہ صحافت نے دراصل برادرانہ تنقید نہیں کی بلکہ معاندانہ تضحیک کی ہے۔ حکومت نے مداخلت کر کے بعض ذرائع کو بند کرنے کی ضرور سعی کی ہے لیکن ہمارے ہاں عربوں کی جگ ہنسائی کا سامان اس قدر بہم پہنچایا جا چکا تھا کہ اس فتنے کی سرکوبی پوری طرح نہ ہو سکی۔ فلسطین کے مسئلے کو کماحقہٗ سمجھنے کے لئے قوم کی عالمی سیاست کے محرکات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت تدبر کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن جماعت اسلامی اور ملک کی عام صحافت سے تدبر کا تقاضہ ـــ چہ معنی دارد؟

غنیمت ہے کہ اس مسئلے کو صحیح پس منظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس معاندانہ پروپیگنڈے کا کچھ جواب سامنے آیا ہے جو اپنوں نے غیروں سے مستعار لے کر اپنوں کے خلاف کیا۔ یہ جواب "محشرِ فلسطین" کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے جو جنرل محمد اکبر خان اور خورشید عالم کی مشترکہ تصنیف ہے۔

احباب انہیں "محترم کردارِ عالم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے سوچنے کا انداز اس لحاظ سے بطورِ خاص قابلِ قدر ہے کہ آپ بین الاقوامی میدان میں پاکستان اور عالمِ اسلام کے مقام اور کردار کی نشاندہی بڑی دیدہ ریزی سے کر رہے ہیں۔ "محشرِ فلسطین" کا حصہ دوم انہی خورشید عالم صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں فلسطین کا تاریخی جائزہ بھی ہے اور سیاسی مطالعہ بھی۔ ان کا ایک باب جس میں عالمی سیاست میں دوستی اور دشمنی کے تصور کو واضح کیا گیا ہے، خاص طور پر سنجیدہ مطالعہ کا متقاضی ہے۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "...... مسلمان علاقے ایسی اہمیت کے مالک ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ دینے پر آجائیں تو بڑی طاقتیں ان کی دست نگر ہو جائیں۔ عربوں نے اس مضبوط رشتے سے بالعموم بے اعتنائی برتی اور ان میں سے بعض نے تو اُس بھارت پر تکیہ کیا جو عالمی بساط پر امریکی استعمار کا مہرہ بن کر ایشیا اور افریقہ کی غلامی اور ذلت کا سامان پیدا کرنے میں لگا ہوا ہے اس جسمانی طور پر عظیم اور کردار کے لحاظ سے آبرو باختہ ملک پر بھروسہ کرکے عرب خسارے ہی کا سودا کر سکتے تھے۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی رستاخیز سے دوست اور دشمن کی تمیز آسان ہو گئی ہے، نیز عالمی سطح پر دوستی اور دشمنی کے تقاضے واضح تر ہو گئے ہیں۔ خود پاکستان کے لئے اس میں موعظت اور عبرت ہے۔ پاکستان اور اعراب کے تنازعات کا حل ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان نے ستمبر کے تاریخی معرکے میں برائی العین دیکھ لیا ہے کہ اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"محشرِ فلسطین" کا جنگی حصہ میجر جنرل محمد اکبر خان نے لکھا ہے۔ جنرل اکبر خان صاحبِ سیف ہی نہیں صاحبِ قلم بھی ہیں۔ انہوں نے فنِ حرب کے متعلق بالعموم اور ہمارے قرنِ اول کے معرکوں کے متعلق بالخصوص عمدہ مواد فراہم کیا ہے۔

"محشرِ فلسطین" میں جنرل اکبر خان نے صلیبی جنگوں کا تذکرہ کرکے واضح کیا ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگِ فلسطین بھی صلیبی جنگوں کی ایک کڑی تھی۔ آپ نے صحرائے سینائی میں ٹینکوں کی جنگ اور اسرائیلی ہوائی بیڑے کے برق رفتار حملے کے متعلق بعض ایسے انکشافات کئے ہیں جو قارئین کے لئے یقیناً نئے ہوں گے۔ آپ نے میدانِ جنگ کا تفصیلی تجزیہ کرکے اس قسم کے سوالوں کے واضح جواب پیش کئے ہیں ــــ جنگی نقطۂ نگاہ سے اسرائیلیوں کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ عرب کس طرح دھوکے میں آگئے؟ انہی حالات میں پاک افواج نے بھارتی لشکر کا بھرلور اور اچانک وار سہہ کر کس طرح کامیاب جوابی حملہ کیا تھا؟ سینائی اور سیالکوٹ

کی ٹینکوں کی جنگ میں کیا فرق تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

دونوں مصنفین نے جس قلبی خلوص اور بالغ نظری سے اس مسئلہ کا حل تجویز کیا ہے اس نے "محشر فلسطین" ایک منفرد کتاب بن گئی ہے۔ تاریخ و سیاست کے طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ معلومات افزا بھی ہوگا اور فکر انگیز بھی۔

کتاب آفسٹ پر سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

---(۰)---

۲۔ کلچر اوف اسلام (انگریزی)

مصنف: افضل اقبال صاحب۔　　　　شائع کردہ: انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک کلچر۔ لاہور

صفحات: تقریباً ۳۰۰۔　طباعت: عمدہ، کاغذ: سفید، قیمت مجلد: بیس روپیہ۔

"کلچر" کے موضوع پر جب بھی کوئی کتاب ہمارے سامنے آتی ہے ہم لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہیں کیونکہ (اور تو اور) ہمیں آج تک کہیں سے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ "کلچر" کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے۔ اور جب کتاب کا عنوان ہو "اسلامک کلچر" تو ہمارے شدتِ شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نے اسی شدتِ اشتیاق سے زیرِ تبصرہ کتاب کو اٹھایا لیکن انتہائے تاسف سے رکھ دیا کہ ہماری یہ حسرت اس سے بھی پوری نہ ہو سکی۔ صاحبِ کتاب نے تمہید میں کلچر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

ہمارے ماضی کی کامرانیوں، روایات اور تجربات کے اجتماعی حافظہ کا نام کلچر ہے۔ (ص ۱)

اور اس کے بعد اسلامی کلچر کے متعلق لکھا ہے کہ

اس میں زبان، اور لٹریچر، آرٹ اور آرکیٹیکچر، اسماء اور تعارفات، رسوم و روایات کے اختلاف کی گنجائش ہے۔ (ص ۱۷)

سوال یہ ہے کہ اگر اس میں (اور تو اور) ماضی کی روایات تک میں اختلاف کی گنجائش ہے تو پھر اسلامی کلچر کس بات کے اجتماعی حافظہ کا نام ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا محض نام ہی اسلامک کلچر ہے ورنہ یہ ماحصل اسلام کے ابتدائی اور بعد کے مسلمانوں کی فقہ، فلسفہ، مختلف فرقوں کے عقاید و مسالک کی سرسری سی تاریخ ہے۔

جہاں تک دینِ اسلام کا تعلق ہے وہ مصنف کے نزدیک اسی قسم کا ہمہ سماجی مذہب ہے جس کا تصور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں پیش کیا تھا اور جس کی رو سے مسلمان ہونے کے لئے اس کتاب کی تسلیم کی اطاعت بھی ضروری نہیں جسے خدا نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا تھا۔ مسلمان ہونے کے لئے

یہ شرط بعد میں لگائی گئی ہے۔ (ص ۲۱-۲۰)

"اسلام پر ایرانی مذہب کے اثرات" کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جو کہا تھا کہ زر و سیم کا اکتناز ناجائز ہے تو یہ (قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ نہیں بلکہ) ایرانی مزدک کی تعلیم کی صدائے بازگشت تھی۔ (ص ۱۱۱)

رسول اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ حضورؐ نزولِ وحی کے بعد بھی اَن پڑھ رہے تھے (ص ۱۳۹) — (حالانکہ قرآن کریم اس کی صراحت کرتا ہے کہ حضورؐ کی یہ کیفیت نزولِ قرآن سے پیشتر کے زمانے میں تھی)

(۰)

ماہنامہ المعارف

ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) کا ترجمان، ماہنامہ ثقافت، قریب بارہ برس سے شائع ہو رہا تھا۔ اب انہوں نے اس کا نام المعارف رکھ دیا ہے۔ اس کا جنوری فروری ۱۹۶۸ء کا مشترکہ شمارہ اس وقت ہمارے زیرِ تبصرہ ہے۔ اس کا موضوع ہے "پاکستان کے بیس سال"۔ اس میں مختلف اہلِ قلم حضرات کے مقالات درج ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ گزشتہ بیس سال میں، پاکستان نے ان شعبوں میں کس قدر ترقی کی ہے۔ ان شعبوں میں، ادب، ثقافت، فنونِ لطیفہ، اسلام، دینیات کی تعلیم، پاکستانی ثقافت اور خود ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ شامل ہیں اور مقالات کا معیار بھی خاصا ہے۔ ہم نے غنیمت سمجھا ہے کہ (اس تبدیلیٔ نام سے) اس ماہنامہ نے "آسمان کی لاہوتی فضاؤں" سے نیچے اتر کر کچھ "زمین کی باتیں" کرنا شروع کی ہیں، ورنہ اس سے پہلے (ثقافت مرحوم) دور از کار نظری مباحث کی نظر ہو جاتا تھا۔ پاکستان اس وقت جس دور سے گزر رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہر سوچنے، بولنے اور لکھنے والا، ان مسائل کے متعلق کچھ کہے جن سے یہ قوم دوچار ہے۔ اور دھنیے کی طرح پرانی روئی نہ دھنتا رہے۔ اگر المعارف نے اس تبدیلی کو برقرار رکھا تو ہمیں امید ہے کہ یہ قوم کی مفید خدمت کر سکے گا۔ اس ماہنامہ کا سالانہ چندہ ۸/- روپے ہے اور قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے۔

(۰)

نسخۂ شفا

محترم حکیم عبداللہ شاہ حسنی القادری نے ۴۶ صفحات کے اس پمفلٹ میں یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید سے بے اعتنائی برت کر کس قدر نقصان اٹھایا ہے۔ اور اس کی تلافی تمسک بالقرآن کے سوا کچھ نہیں۔

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا دورۂ لائل پور

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید!

(نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لائلپور)

۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو طلوع ہونے والا سورج فرقانِ حمید کے سرگشتگانِ شوق کو لائل پور کے ہوائی اڈے پہ بیتابانہ رواں دواں دیکھ رہا تھا۔ جوں جوں طیارے کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ وفورِ شوق کا ایک عجیب عالم تھا۔ فضا کو ایک عجیب سرمستی محیط کئے ہوئے تھی۔ طیارہ جونہی زمین پر اترا تمام احباب دیوانہ وار آگے بڑھے۔ مفکرِ قرآن مسکراتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ اب شمع پروانوں کے جمگھٹ میں تھی۔ ہر فرد "سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا" کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد سرزمین لائلپور داعیِ انقلاب کے قدم چوم رہی تھی۔ مدت کی تمنائیں آج برآئی تھیں۔ احباب کا ہجوم میرِ کارواں کے جلو میں ہوائی اڈے سے باہر نکلا اور منزلِ مقصود کی جانب چل نکلا۔ یہ منزلِ مراد ڈاکٹر ملک محمد حیات صاحب کا دولتکدہ تھا جنہیں مفکرِ قرآن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔

پریس کانفرنس

دس بجے صبح سٹیبزن ہوٹل میں پریس کانفرنس منعقد ہوئی۔ ابتداءً پرویز صاحب نے مختصر الفاظ میں تحریک طلوعِ اسلام کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک کا مقصد نہ تو شورش برپا کرنا ہے اور نہ ہنگامے بلکہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے متعارف کرانا ہے۔ انہوں نے اسلام کے معاشی نظام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرے اور اس کے لئے ذرائعِ پیداوار کو مملکت کی تحویل میں ہونا چاہیئے۔ اسلام اور اشتراکیت کے فلسفۂ زندگی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ

ایں خدا نا سے دہد جانے دہد آں خدا نانے دہد جانے بُرد

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کا فرق بیان کرتے ہوئے کہا کہ مغربی جمہوریت میں کوئی شے غیر متبدل نہیں ہے جبکہ اسلامی جمہوریت میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) جو قرآن میں محفوظ ہیں کسی صورت میں بدل نہیں سکتیں۔ ان کی پابندی کرتے ہوئے مملکت باہمی مشاورت سے زمانے کے حالات کے مطابق فیصلے کر سکتی ہے۔

مفکرِ قرآن نے نمائندگانِ پریس کے سوالات کے جوابات بڑے دلنشیں پیرائے میں دیئے۔ صحافیوں نے تحریک کے لٹریچر کی خواہش ظاہر کی وہ ایک حسین تاثر لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔

کونسل ہال میں خطاب

آٹھ بجے شام ڈسٹرکٹ کونسل ہال لائلپور میں مفکرِ قرآن کا خطاب عام تھا۔ ہال وقت سے

پہلے ہی بھر چکا تھا اس لئے باہر بھی نشستوں کا انتظام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب کی صدارت میں اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ حافظ محمد یحییٰ صاحب نے والہانہ جذبے سے تلاوت کلام پاک فرمائی۔ اشتیاق حفیظ صاحب نے ترنم سے کلامِ اقبال پیش کیا۔ محترم ملک محمد شریف صاحب نے اپنے دلنشیں انداز میں مفکرِ قرآن کا تعارف کراتے ہوئے جب کہا کہ "انہوں نے بیسویں صدی کی عقل کو مسلمان کیا ہے" تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد مفکرِ قرآن سٹیج پر تشریف لے آئے۔ احباب کی سپاس گزاری کے بعد انہوں نے آج کے بصیرت افروز خطاب کا آغاز کیا۔ موضوع تھا "اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں" انہوں نے متعدد احادیث، تاریخی واقعات اور قرآنی دفتین میں محفوظ حقائق کو سامنے لا کر واضح کیا کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرے اور ذرائع پیداوار کو مملکت کی تحویل میں رکھے۔ یہ بصیرت افروز خطاب جس جذب و انہماک سے سنا گیا اس کو ضبطِ تحریر میں تولانا ممکن نہیں البتہ لائلپور کے اس ہال کے در و دیوار اس کے شاہد ہیں کہ شاید آج تک کوئی خطاب اس ذوق و شوق سے نہیں سنا گیا۔

خطاب کے بعد حاضرین کو استفسارات کی دعوت دی گئی۔ کافی تعداد میں سوال سٹیج پر پہنچے جن میں چند اہم اور موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات مفکرِ قرآن نے اپنے خاص خرد افروز انداز میں دیئے۔ سامعین حد درجہ متکیف و متاثر ہوئے۔ خطاب کے بعد بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور کی طرف سے لٹریچر مفت تقسیم کیا گیا جسے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء

مفکرِ قرآن نے گیارہ بجے صبح بار ایسوسی ایشن سے خطاب فرمایا۔ موضوع تھا "اسلام میں فکر کا مقام" وکلاء صاحبان کثیر تعداد میں شریکِ محفل تھے۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد سیکرٹری بار ایسوسی ایشن نے مفکرِ قرآن کو دعوت دی کہ وہ اپنے خیالات سے حاضرین کو مستفیض فرمائیں۔ تو بیسویں صدی کی فکر بیباک کو مسلمان کرنے والی اس صاحبِ عزم شخصیت نے اپنے دلنشیں پیرایہ میں اسلام میں فکر کے مقام کی وضاحت کی۔ یہ طرزِ بیان اسقدر شگفتہ اور مدلل تھا کہ سامعین جھوم جھوم گئے۔ انہیں پہلی بار علم ہوا کہ قرآن کس طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ خطاب کے بعد پرویز صاحب نے مستفسرین کے سوالات کے نہایت اطمینان بخش جواب دیئے۔

مجلسِ احباب

شام کے چار بجے احباب ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر جمع ہوئے۔ سب احباب اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو مختلف مسائل سامنے آئے۔ مختلف سوالات پیش کئے گئے۔ ان کے جواب میں مفکرِ قرآن معارف و بصائر کے جام کے جام لنڈھا رہے تھے۔ حاضرین پر ایک سرمدی کیف و سرمستی کا عالم طاری تھا۔ ہر ایک کا جی چاہتا تھا کہ یہ محفل وقت کی بندش سے آزاد ہو جائے مگر گاڑی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مفکرِ قرآن کو واپس لاہور چلے جانا تھا۔ لہٰذا احباب بادلِ ناخواستہ میر کارواں کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر جمع ہوئے۔ دو دن کی طول طویل محفلوں کے باوجود روح کی تشنگی باقی تھی۔ یہ احساس چہروں سے جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ احباب اپنے محبوب قائد سے محوِ گفتگو تھے کہ اتنے میں گاڑی سرکنے لگی اور احباب نے قافلۂ قرآنی کے اس سرخیل کو بادیدۂ پرنم و اشتیاق یہ کہہ کر رخصت کیا کہ — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

اب لائلپور کو ان کی دوبارہ تشریف آوری کا انتظار ہے۔

——(※)——

ابوشہاب رفیع اللہ

منکرین حدیث کون ہیں؟

طلوع اسلام کے خلاف یہ اعتراض آپ نے عام طور پر سنا ہوگا کہ یہ منکر حدیث ہے۔ اس انکار حدیث کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جو حدیث قرآن کریم کے خلاف ہو یا اس سے حضورؐ یا صحابہ رضؓ کبار کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، طلوع اسلام کہتا ہے کہ وہ حدیث رسول اللہ کی ہو نہیں سکتی حضورؐ کی طرف اس کی نسبت غلط ہے یعنی طلوع اسلام حدیث کا انکار نہیں کرتا بلکہ غلط حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی حدیث نہیں ہو سکتی اس کے برعکس ہمارے علماء کرام ہیں کہ وہ متبع حدیث ہونے کے مدعی ہیں لیکن کیفیت یہ ہے کہ جن حدیثوں کو وہ خود صحیح تسلیم کرتے ہیں ان کا عمل ان کے خلاف ہے اور اتباع ان حدیثوں کا کرتے ہیں جو خود محدثین کے نزدیک وضعی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ فرمائیے کہ فی الحقیقت منکر حدیث کون ہے؟ محترم ابوشہاب رفیع اللہ صاحب نے بڑی کاوش و تحقیق سے ان حضرات کے اس عملی انکار حدیث کی نقاب کشائی کی ہے اس سے ان کا (اور طلوع اسلام کا) مقصد ایک ایسی علمی تحقیق ہے جس کا عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ امید ہے قارئین ان کی اس کاوش کو مفید پائیں گے۔　　(طلوع اسلام)

اصطلاح میں حدیث شریف کی مختصر تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا عمل ہے یا کوئی ایسا کام جو آپؐ کی موجودگی میں کیا گیا ہو اور آپ نے اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد آپ کے یہ تمام اقوال و افعال سینکڑوں برس تک زبانی امت تک پہنچتے رہے۔ ان اقوال و افعال کو اس طرح روایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو گئی جن میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ جس کی وجہ سے احادیث میں بہت سا رطب و یابس بھی جمع ہو گیا۔ اس رطب و یابس کو علیحدہ کرنے کے لئے ائمہ حدیث آگے بڑھے اور انہوں نے برسوں کی محنت سے ان تمام راویانِ حدیث

کے حالات جمع کئے۔ پھران کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی بنیاد پر صحیح احادیث کو احادیث کی مختلف کتابوں میں جمع کیا گیا۔ ان راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ قرار دینے کے بارے میں انہوں نے کچھ اصول اور وجہے مقرر کئے۔ اور ان کے مطابق صحت وضعف کے لحاظ سے کوئی بیالیس حدیث کی متنیں قرار دی گئیں۔ تاہم ان میں سب سے بڑی مشترک چیز راوی کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا تھا جس پر ابھی تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں جب فقہ کو مرتب کیا گیا تو عراق کے فقہاء یعنی فقہاء احناف نے بعض مسائل میں اپنی رائے سے فیصلے دیئے جو بعض صورتوں میں صحیح احادیث کے مخالف تھے چنانچہ اس سلسلے میں ان میں اور ائمہ اہل حدیث میں اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ ان کو اہل رائے کے نام سے پکارنے لگے۔ یہ اختلاف ابھی تک چلا آرہا ہے لیکن صرف چند فروعی مسائل تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ مثلاً رفع الیدین، آمین بالجہر وغیرہ۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، ہماری تحقیق کے مطابق ان مسائل میں صحیح احادیث سے اہلحدیث کے مسلک کی ہی تائید ہوتی ہے اور ان کے مقابلے میں جو احادیث حنفی حضرات کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، ان کا حدیث کی کتابوں میں کہیں وجود تک نہیں ہے[1]

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جہاں ان فروعی مسائل میں احادیث کی حمایت میں خوب بحث مباحثے کئے جاتے ہیں وہاں عملی زندگی کے بڑے بڑے مسائل میں ان تمام حضرات کا (خواہ وہ حنفی ہوں یا اہلحدیث) اپنا عمل، صحیح احادیث کے خلاف ہوتا ہے۔ قارئین یہ سنکر حیران ہوں گے کہ آج اکثر بڑے بڑے عملی مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف عمل ہو رہا ہے لیکن حامیانِ حدیث کو کبھی اسکا احساس تک نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ آج حدیث شریف کو کچھ نئے 'حامی' بھی مل گئے ہیں جو خود تو اکثر معاملات کے مسائل میں صحیح احادیث کا انکار کرتے ہیں لیکن عامۃ الناس کو بے وقوف بنانے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو منکرینِ حدیث کے پروپیگنڈے کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ حضرات اپنی اس چال میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوچکے ہیں یہاں تک کہ کچھ اہلحدیث اہل علم تک ان کے فریب میں آچکے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان معاملات کے مسائل کی فہرست قارئین کے سامنے لائیں جن میں صحیح احادیث کا علی الاعلان انکار کیا جاتا ہے۔ تاکہ عامۃ الناس کو یہ معلوم ہوسکے کہ منکرینِ حدیث کون ہیں۔ اور یہ کہ حدیث شریف تک کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے دریغ

---

[1] جو صاحب اس موضوع پر مفصل بحث دیکھنا چاہیں وہ ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد اول صفحہ ۲۱۷ اور نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۱۸۷ ملاحظہ فرمائیں۔ ۱۲۔

نہیں کیا جاتا۔

ان عملی مسائل کی فہرست اگرچہ خاصی طویل ہے۔ لیکن ان میں سے ہم مندرجہ ذیل تیس اہم مسائل کے بارے میں تفصیلات پیش کریں گے جو انشاءاللہ حدیث شریف کے بارے میں دوہری رویّہ رکھنے والوں کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ثابت ہونگی۔

(۱) عبادت پر اُجرت لینا۔ (۲) تعویذ اور گنڈے۔
(۳) دم یا جھاڑ پھونک۔ (۴) نذر ماننا۔
(۵) زکوٰۃ کی وصولی کے حقدار۔ (۶) کارخانوں اور تجارتی اداروں پر زکوٰۃ۔
(۷) اُضحیہ یا قربانی۔ (۸) حج میں قربانی۔
(۹) عیدین کے خطبے (۱۰) محرابِ مسجد۔
(۱۱) شادی سے پہلے منسوبہ کو دیکھنا۔ (۱۲) ولی کے بغیر نکاح۔
(۱۳) مسئلہ کفارت۔ (۱۴) اعلان النکاح۔
(۱۵) تعددِ ازدواج۔ (۱۶) نکاح شغار۔
(۱۷) طلاق و خلع۔ (۱۸) طلاق بدعت۔
(۱۹) بچوں کی تربیت۔ (۲۰) ضبطِ ولادت۔
(۲۱) کثرتِ اُمت۔ (۲۲) مخابرہ۔
(۲۳) مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ۔ (۲۴) ربٰو الفضل۔
(۲۵) حرمتِ شراب۔ (۲۶) شراب اور سرکہ۔
(۲۷) بادشاہ کے خدائی حقوق (۲۸) موسیقی کی حلت و حرمت۔
(۲۹) انکارِ حدیث کی سب سے خطرناک صورت۔ (۳۰) انبیاء کے وارث۔

(۱) عبادات پر اُجرت لینا

احادیث میں عبادات پر اُجرت لینے سے واضح طور پر منع کیا گیا ہے۔ سنن ابوداؤد، سنن نسائی، اور مشکوٰۃ المصابیح میں ایک حدیث ان الفاظ میں آتی ہے:۔

عَنْ عُثْمَانَ ابْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اجْعَلْنِیْ اِمَامَ قَوْمِیْ قَالَ اَنْتَ اِمَامُھُمْ وَاقْتَدِ بِاَضْعَفِھِمْ

وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَا يَأْخُذُ عَلٰى اَذَانِهٖ اَجْرًا۔

حضرت عثمان بن ابوالعاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے اپنی قوم کا امام بنا دیجئے۔ آپ نے اس کی منظوری دے دی۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ کمزوروں کا خیال رکھنا اور ایسا مؤذن مقرر کرنا جو اُجرت نہ لے۔

اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ لیکن چونکہ ائمہ فقہ کو بھی اس مسئلہ سے اتفاق ہے اس لئے ان تمام احادیث کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ فقہ کی ایک عام کتاب قدوری تک میں یہ فیصلہ موجود ہے۔

لَا يَجُوْزُ الْاِسْتِيْجَارُ عَلَى الْاَذَانِ وَالْاِمَامَةِ وَتَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ وَالْحَجِّ[1]

(ترجمہ) اذان، امامتِ نماز، تعلیم القرآن اور حج پر اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔

تعلیم القرآن کی اُجرت کے بارے میں جمہور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور بعض اسے جائز قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے بعض احادیث کے اشارات سے تائید حاصل کرتے ہیں۔ تاہم ائمہ احناف اسے بھی ہر صورت میں ناجائز سمجھتے ہیں لیکن آج ہمارے ہاں کی لاکھوں مساجد کے ائمہ اور مؤذن ان احادیث کے خلاف نماز پڑھانے وغیرہ کی اجرت وصول کرتے ہیں۔

(۲) تعویذ اور گنڈے

بعض احادیث میں دم کرنے کرانے کی بڑی محدود سی اجازت ملتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ لیکن جہاں تک تعویذ وغیرہ لکھنے کا تعلق ہے اس کی اجازت تو کجا، احادیث میں اس کی واضح ممانعت آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تائید میں کوئی جھوٹی حدیث بھی نہیں ملتی۔ اس کے شرک ہونے کے بارے میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ۔ رَوَاهُ احمد و ابوداؤد وابن ماجه۔ وَالتِّوَلَةُ ضَرْبٌ مِنَ السِّحْرِ قَالَ الْاَصْمَعِيُّ هُوَ تَحَبُّبُ الْمَرْاَةِ اِلٰى زَوْجِهَا۔[2]

---

[1] قدوری کتاب الاجارۃ صفحہ ۱۰۴۔ [2] نیل الاوطار۔ جلد ۸۔ صفحہ ۲۱۸۔

(ترجمہ) فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ دم کرنا، اور گنڈے تعویذ شرک ہیں۔ یہ حدیث مسند احمد، ابوداؤد، اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے اور تولہ (جس میں گنڈے اور تعویذ دونوں کا مفہوم شامل ہے) جادو کی ایک قسم ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اس عمل سے عورت خاوند کی محبت جیت جاتی ہے۔

ائمہ حدیث کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

تمائم کی تفسیر علامہ شوکانی یوں فرماتے ہیں۔

هِيَ خَرَزَاتٌ كَانَتِ الْعَرَبُ تُعَلِّقُهَا عَلَى اَوْلَادِهِمْ يَمْنَعُوْنَ بِهَا الْعَيْنَ فِيْ زَعْمِهِمْ فَاَبْطَلَهُ الْاِسْلَامُ۔ [2]

(ترجمہ) یہ کوڑیاں تھیں جنہیں عرب اپنے بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے بطور تعویذ استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے اس فعل کو باطل قرار دیا ہے۔

اور التولۃ جس میں گنڈا اور تعویذ دونوں کا مفہوم شامل ہے کی عملی تفسیر حضرت ابن مسعودؓ سے یوں مروی ہے جسے حاکم اور ابن حبان نے بروایت صحیح بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن مسعودؓ نے اپنی بیوی کے گلے میں ایک تعویذ دیکھا تو اسے کھینچ کر کاٹ دیا اور فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنا تھا کہ دم کرنا اور گنڈے تعویذ سب شرک ہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ دم کرنا اور تعویذ باندھنا تو معلوم چیزیں ہیں لیکن یہ "التولۃ" کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ جادو ایسی چیز ہے جسے عورتیں مردوں کی محبت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ایک دھاگہ ہوتا ہے جس پر جادو وغیرہ پھونکا جاتا ہے یا کاغذ پر لکھا جاتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی محبت حاصل کر سکیں۔ [3]

گنڈے اور تعویذ کا یہ تمام کاروبار جسے ہاں ان تفصیلات سے بھی زیادہ اور بڑے وسیع پیمانے پر مروج ہے۔ بلکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر جاہل عوام جو عام طور پر نماز تک کے کبھی قریب تک نہیں گئے صرف انہی چیزوں کی خاطر مولویوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح احادیث کے مقابلے میں "یہ کاروبار" دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے لیکن کبھی کسی صاحب علم

---

[1] نیل الاوطار جلد ۸۔ صفحہ ۲۱۹۔ [2] ایضاً۔ صفحہ ۲۲۰۔ [3] ایضاً۔

نے اس کی طرف انگلی تک نہیں اٹھائی۔

(۳) دم یا جھاڑ پھونک

مذکورہ بالا حدیث میں دم کرنے کرانے کی بھی ممانعت ہے لیکن دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف تین صورتوں میں اس کی رخصت دی تھی۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رُقْيَةٍ مِنَ الْعَيْنِ وَ الْحُمَّةِ وَ النَّمْلَةِ - رواہ مسلم و احمد و الترمذی و ابن ماجہ

وَالنَّمْلَةُ قُرُوْحٌ تَخْرُجُ مِنَ الْجَنْبِ[1]

(ترجمہ) حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نظر لگنے، بچھو کے کاٹے اور نملۃ کے دم کی رخصت دی۔ نملہ ایک قسم کا پھوڑا ہوتا تھا جو پہلو میں نکلتا تھا۔

اس حدیث شریف میں "رخصت" کے الفاظ قابل غور ہیں۔

بعض سلف صالحین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف دو امور میں اس کی رخصت دی تھی۔

وَقَالَ قَوْمٌ لَا تَجُوْزُ الرُّقْيَةُ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ وَالْحُمَةِ كَمَا فِيْ حَدِيْثِ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ لَا رُقْيَةَ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ اَوْ حُمَةٍ - [2]

(ترجمہ) بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ صرف دو امور یعنی نظر لگنے اور بچھو کے کاٹے میں دم کی رخصت ہے جیسا کہ حضرت عمران بن حصین کی روایت کردہ حدیث ہے کہ نظر لگنے اور بچھو کے کاٹے کے علاوہ دم کرانا جائز نہیں۔

ان دو صورتوں میں بھی دم کرنے کرانے کی رخصت کوئی دینی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ مسلمان غیر مسلموں سے دم کراتے تھے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو تین صورتوں میں دم کی اجازت دینے کے باوجود اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ایک حدیث جس میں بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونے والے مومنین کا ذکر ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فَقَالَ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ - [3]

---

[1] نیل الاوطار جلد ۸ - صفحہ ۳۱۹ - [2] ایضاً - [3] بخاری شریف کتاب الطب نمبر ۷۹، باب مَنْ لَمْ يَرْقِ -

(ترجمہ) آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دم نہیں کراتے اور نہ بدشگونی لیتے ہیں اور نہ داغتے ہیں اور اپنے پالنے والے پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اس حدیث سے واضح الفاظ میں یہ عیاں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف دو تین صورتوں میں دم کرانے کی اجازت دینے کے باوجود اس کو پسندیدہ خیال نہ کیا[1]۔ لیکن آج تو بہت سے دین داروں کا "کاروبار" ہی دم اور جھاڑ پھونک پر چل رہا ہے۔ اور جس چیز کی احادیث میں ممانعت ہے اسے عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔

(۴) نذر ماننا

عام جہالت کی وجہ سے ہمارے عوام میں یہ چیز ایک دینی رسم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کے نام پر بھی مانی جاتی ہے اور اولیاء اللہ کے نام پر بھی۔ ہمارے چند علماء نے اگر اس کے خلاف کوئی آواز اٹھائی ہے تو اس حد تک کہ غیر اللہ کے لئے نذر و نیاز ناجائز ہے۔ حالانکہ اگر صحیح احادیث کو سامنے رکھا جائے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی نذر ماننے سے منع فرمایا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ اِنَّهٗ لَا يَرُدُّ شَيْئًا وَاِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ۔ رواہ الجماعۃ الا الترمذی و للجماعۃ الا ابا داؤد مثل معناہ من روایۃ ابی ہریرۃ[2]

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے منت وغیرہ ماننے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کسی چیز کو لوٹاتی نہیں۔ صرف بخیل آدمی سے کچھ رقم نکالنے کا سبب ضرور ہے۔

آج نذر و نیاز کے جائز و ناجائز کاروبار نے جو حیثیت اختیار کر رکھی ہے اس سے قارئین اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔

(۵) زکوٰۃ کی وصولی کے حقدار

جن مسائل کا مال و دولت سے تعلق ہے، ان میں جس طرح احادیث سے انکار کیا جاتا ہے، اسکی جھلک

---

[1] ہم نہیں سمجھتے کہ حضورؐ نے ایک ایسے کام کی اجازت دی ہوگی جسے آپؐ بھی ناپسند فرماتے ہوں۔ (طلوع اسلام)

[2] نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۲۴۹

قارئین دیکھتے آرہے ہوں گے۔ زکوٰۃ اسلام میں اسلامی حکومت کے ایک ٹیکس کی حیثیت[1] رکھتی ہے اور اس امر پر فقہائے امت کا اجماع ہے کہ ایک اسلامی ملک میں مال پر زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ علامہ شعرانی فرماتے ہیں۔

اجمع العلماء .... علیٰ انہ لیس فی المال سوی الزکاۃ۔[2]

اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی حق نہیں ہے اور یہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حق صرف مسلمانوں کی حکومت ہی کو حاصل ہے چاہے وہ معیاری اسلامی ہو یا نہ ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔

انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قال انھا ستکون بعدی اثرۃ وامور تنکرونھا۔ قالوا یا رسول اللہ فما تامرنا ؟ قال تؤدون الحق الذی علیکم و تسألون اللہ الذی لکم۔[3]

(ترجمہ) حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تمہیں ایسے معاملات پیش آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرو گے۔ تو صحابہؓ نے عرض کی کہ حضورؐ! آپ ہمیں اس کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنا حق حکومت کو ادا کرو اور ان پر جو تمہارا حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے طلب کرو۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے۔

عن وائل ابن حجر قال سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ورجل یسألہ، فقال ارأیت ان کان علینا امراء یمنعونا حقنا ویسئلونا حقھم؟ قال اسمعوا واطیعوا فانما علیھم ما حملوا و علیکم ما حملتم۔ رواہ مسلم والترمذی وصححہ۔[4]

(ترجمہ) حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا اور ایک شخص آپ سے دریافت کر رہا تھا کہ اگر حکمران ہمارے حقوق پورے نہ کریں اور اپنا حق یعنی زکوٰۃ طلب کریں تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہمیں ان

---

[1] "ایک ٹیکس" نہیں بلکہ حکومت کی پوری آمدنی" زکوٰۃ" (لوگوں کو نشوونما دینے کا ذریعہ) ہوتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] المیزان الکبریٰ جلد ۲، صفحہ ۲۔ [3] نیل الاوطار جلد ۴، صفحہ ۱۴۵۔ [4] ایضاً۔

کی مکمل اطاعت کرنی چاہیئے۔ وہ اس کے ذمہ دار ہیں جو ان پر لازم ہے اور تم کو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب" اسلامی حکومت "مسلمانوں کی حکومت میں تبدیل ہوتی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی احادیث کے مطابق عمل کرنے کا فتوےٰ دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ زکوٰۃ کس کے حوالے کی جائے تو آپ نے فرمایا" ادفعها الی هؤلاء القوم یعنی الامراء (یعنی وقت کے حکمرانوں کو ادا کرو) اس شخص نے ان حکمرانوں کی عیش و عشرت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اذ تتخذون بها ثیابًا وطیبًا۔ (کہ یہ تو زکوٰۃ کو عیش و عشرت میں اڑا دینگے) لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے باوجود زکوٰۃ اپنی حکمرانوں کو ہی ادا کرنی ہوگی۔ [1]

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔

ادفعوا صدقۃ اموالکم الی من ولاہ اللہ امورکم فمن بر فلنفسہ ومن اثم فعلیھا۔ (ایضاً)

(ترجمہ) کہ تم اپنے اموال کی زکوٰۃ ان حکمرانوں کے سپرد کرو جو اللہ تعالےٰ نے تم پر مقرر کئے ہیں جو نیکی کرے گا تو وہ اس کے لئے ہے اور جو زیادتی کرے گا وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

دوسرے صحابہ بھی اسی قسم کا ہی فتوےٰ دیا کرتے تھے۔ (ایضاً) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس سے بھی زیادہ واضح ایک اور روایت ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔

قال ادفعوھا الیھم وان شربوا الخمور۔ (ایضاً)

زکوٰۃ اپنی حکمرانوں ہی کو دینی ہوگی چاہے وہ شراب ہی کیوں نہ پیتے ہوں۔

مذکورہ بالا احادیث اور صحابہ کرامؓ کے فیصلوں کو نقل کرنے کے بعد علامہ شوکانی جمہور علماء کا فیصلہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

والاحادیث المذکورۃ فی الباب استدل بھا الجمھور علی جواز دفع الزکوٰۃ الی سلاطین الجور واجزاتھا۔ (ایضاً)

(ترجمہ) اس باب میں مذکور احادیث سے جمہور فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ زکوٰۃ ظالم بادشاہوں کو دینی جائز ہے۔

لیکن ہمارے عاشقانِ حدیث نے ان احادیث کی مخالفت میں دو عملی کا فیصلہ دے رکھا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت کو ٹیکس ادا کرو اور زکوٰۃ غرباء کے حوالے کرو اور پھر علماء کا طبقہ ہی اپنے آپ کو غرباء میں شمار کرتا ہے اس

---

[1] (ایضاً)

لئے زیادہ تر زکوٰۃ کی رقم انہی کے پاس پہنچ جاتی ہے اور چونکہ اس زکوٰۃ کی رقم میں جماعت اسلامی بھی اپنا حصہ وصول کرتی ہے اس لئے وہ بھی ان احادیث کے خلاف اس قسم کا فتوےٰ دینے میں باک محسوس نہیں کرتی۔ اس کے امیر کا ایک فتویٰ ملاحظہ ہو کہ ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی نافذ ہوں گے[1] یہ لوگ کس طرح اپنے مفاد کے لئے احادیث کے بالکل خلاف دوعملی قائم کئے ہوتے ہیں۔ اور پھر حیرت انگیز امر یہ کہ اسے اسلامی نظام قرار دیا جا رہا ہے۔

۴- کارخانوں اور تجارتی اداروں وغیرہ پر زکوٰۃ

اسلامی حکومت میں مالی نظام کی اس طرح دوعملی قائم کرنے کے بعد (کہ ٹیکس حکومت کو دو اور زکوٰۃ کے حقدار نادار علماء ہیں) زکوٰۃ کے سلسلے میں بڑی عنایت سے دانست سے کام لیا گیا۔ یعنی مالداروں سے کچھ حصہ زکوٰۃ لے کر باقی اربوں روپے معاف کر دیئے۔ اس کی وضاحت اس مثال سے ہوگی۔ مثلاً اگر کسی صاحب مال کے پاس چالیس ہزار روپے نقد ہیں تو اسے سال بعد ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ لیکن اگر وہ صاحب اسی رقم کا مکان یا دوکان وغیرہ خرید کر کرایہ پر اٹھا دے تو یہ زکوٰۃ بھی معاف اور سال میں جو تین ہزار روپیہ اسے کرایہ کی صورت میں ملے گا وہ زاید۔ ہاں وہ کرایہ کی آمدنی سے ساٹھ ستر روپے زکوٰۃ ادا کر دے۔ اس طرح صاحب مال کو زکوٰۃ دینے کی بجائے زکوٰۃ اور کرایہ کی رقم ملا کر تین چار ہزار روپے کی بچت ہوگی۔

اس فیصلے کے لئے علماء حضرات یہ دلیل پیش فرماتے ہیں۔

"کارخانوں یا فیکٹری کی مشینری اور عالیشان عمارات پر جو مولوی صاحبان زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی واضح اور اصولی ہدایات ہیں۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بوجھ لادنے والے اونٹوں پر زکوٰۃ نہیں ہے (بحوالہ فتح القدیر) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک شخص اپنے کاروبار میں جن عوامل پیداوار سے خواہ جانور ہوں خواہ آلات و اوزار خواہ مشینیں کام لیتا ہے ان پر زکوٰۃ نہیں ہے[2]"

اس حدیث کو پیش فرما کر ہمارے مولوی صاحبان اربوں کھربوں کی جائیداد کو جو بڑے بڑے کارخانوں شاندار کوٹھیوں، دوکانوں یا مکانات پر مشتمل ہے، زکوٰۃ سے مستثنےٰ قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے

---

[1] ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۵۵ تا ۵۶

[2] ماہنامہ بینات کراچی۔ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ صفحہ ۵۷ - ۵۸

میں جو حدیث پیش کی جا رہی ہے ان الفاظ میں اس کا حدیث کی کسی کتاب میں وجود تک نہیں صاحب ہدایہ نے جو حدیث ولیس فی العوامل والحوامل والعلوفۃ صدقۃ (کام کرنے والے اور بوجھ اٹھانے والے اور گھر پر کھلائے جانے والے جانوروں پر زکوٰۃ نہیں) پیش کی ہے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اس حدیث کا ان الفاظ کے ساتھ حدیث کی کسی کتاب میں وجود تک نہیں۔ یہ حقیقت خود ہدایہ کے شارح علامہ ابن ہمام صاحب شرح فتح القدیر نے تسلیم کی ہے۔ امام مدینہ یعنی امام مالکؒ کے مسلک سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اس حدیث کا کوئی وجود نہیں کیونکہ وہ کسی مسئلہ کے بارے میں اس وقت تک کوئی فتوےٰ صادر نہیں کرتے تھے جب تک مدینہ شریف کے کم از کم ستر اہل علم اس کے مطابق رائے نہ دیتے تھے۔ ان کا مسلک ہمارے مولویوں کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں۔

لَا یشترط فی وجوب الزکوٰۃ النعم السوم فتجب الزکوٰۃ فیھا متیٰ بلغت نصاباً سواءً کانت سائمۃً ام معلوفۃً ولو فی جمیع السنۃ وسواءً کانت عاملۃً او غیر عاملۃٍ۔ [1]

(ترجمہ) امام مالک کے نزدیک مویشیوں پر زکوٰۃ کے لئے چراگاہوں میں چرنے کی کوئی شرط نہیں۔ چاہے انہیں سارا سال گھر باندھ کر کھلایا جائے یا چراگاہوں میں چرنے کے لئے بھیجا جائے اور چاہے وہ کام کے لئے ہوں یا نہ ہوں، ان سب پر زکوٰۃ لازمی ہے۔ جب نصاب تک پہنچ جائیں۔

اب مولوی صاحبان کا پیش کردہ استدلال اس حدیث کے غلط ثابت ہو جانے کی وجہ سے بے وقعت ہو جاتا ہے۔ اور زکوٰۃ تمام سرمایہ پر ہو گی چاہے وہ کارخانوں کی شکل میں ہو یا شاندار عمارات کی صورت میں۔ کتنی حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان نے ایک بالکل غیر معلوم حدیث کی بنا پر اربوں روپے کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔

(۷) اُضحِیَہ یا قُربانی

اُضحِیَہ جو ہمارے ہاں قُربانی کے نام سے مشہور ہے، کا حکم مندرجہ ذیل پانچ احادیث سے ثابت کیا جاتا ہے۔

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۱ صفحہ ۵۹۷۔

(۱) عن ابی رملة عن محنف بن سلیم انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم
قال بعرفة انّ علی کلّ اھل بیتٍ فی کلّ عامٍ اضحیۃ - لہ
(ترجمہ) ابو رملة محنف بن سلیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں
فرمایا کہ ہر گھر والے پر سال میں ایک مرتبہ قربانی لازم ہے۔
(۲) عن حبیب بن محنف عن ابیہ انّہٗ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یقول بعرفة علی کلّ اھل بیتٍ ان یذبحوا فی کلّ رجبٍ شاۃً وفی کلّ
اضحی شاۃً - ۲ہ
(ترجمہ) حبیب بن محنف اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفات
کے میدان میں یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہر گھر والے پر ایک قربانی ماہ رجب میں اور قربانی حج
کے مہینہ میں لازم ہے۔
(۳) عن الحسن انّ رسول اللہ امر بالاضحی - ۳ہ
(ترجمہ) حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا حکم دیا۔
(۴) عن ابن المسیب عن ابی ھریرة انّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم قال من
وجد سعةً فلیضحّ - ۴ہ
(ترجمہ) حضرت ابو ہریرة سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک خوشحال آدمی
ضرور قربانی کرے۔
(۵) عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وجد سعةً فلم
یضحّ فلا یقرب مصلانا - ۵ہ
حضرت ابو ہریرة سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے استطاعت
کے باوجود قربانی نہیں کی تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے۔

قربانی کے متعلق ان تمام احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن حزم ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ سب
کی سب ضعیف ہیں۔ وکلّ ھذا لیس بشیءٍ ۶ہ یہ ان کا کوئی ذاتی فیصلہ نہیں بلکہ ائمہ حدیث ان احادیث
کے ضعیف ہونے کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں۔

لہ المحلّی لابن حزم۔ جلد ۷ صفحہ ۳۵۶-۳۵۷ - ۲ہ، ۳ہ، ۴ہ، ۵ہ، ۶ہ (ایضاً)

أمّا حديث محنف فعن ابی رملۃ الغامدی وحبیب بن مخنف و کلاھما مجھول لا یدری و امّا حدیث الحسن فمرسل و امّا حدیث ابی ھریرۃ فکلا طریقیہ من روایۃ عبد اللہ بن عیاش ابن عباس القتبانی فلیس معروفًا بالثقۃ۔ ۱

(ترجمہ) مخنف کی دونوں احادیث یعنی ابو رملۃ الغامدی کی روایت سے اور حبیب بن مخنف کی روایت سے تو یہ دونوں مجہول الحال اور گمنام قسم کے راوی ہیں۔ حدیث حسنؓ مرسل ہے اور حضرت ابوھریرہ رضؓ کی دونوں احادیث میں ایک راوی عبداللہ بن عیاش بن عباس القتبانی ہے جو غیر معتبر ہے۔

ان تمام احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن حزمؒ یہاں تک فرماتے ہیں کہ قربانی کے غیر واجب ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

لا یصحّ عن احد من الصحابۃ انّ الاضحیۃ واجبۃ وصحّ انّ الاضحیۃ لیست واجبۃ۔ ۲

(ترجمہ) صحابہ کرام میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ قربانی واجب ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ واجب نہیں ہے۔

بلکہ بڑے بڑے اجل صحابہؓ جیسے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تو جان بوجھ کر قربانی نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں لوگ اسے واجب ہی نہ سمجھ لیں۔

بلغنا انّ ابابکرؓ وعمرؓ کانا لا یضحّیان کراھیۃ ان یقتدی بھما لیظنّ من رآھما انّھا واجبۃ۔ ۳

(ترجمہ) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اس خدشہ سے قربانی نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں لوگ انہیں ایسا کرتے دیکھ کر قربانی کو واجب ہی نہ سمجھ لیں۔

اُمت کے جمہور فقہاء کا فتویٰ بھی انہی احادیث اور صحابہ کرام کے عمل کے مطابق یہ ہے۔

یثاب فاعلھا ولا یعاقب تارکھا۔ ۴

(ترجمہ) قربانی کرنے والا ثواب کا مستحق ہے اور اسے ترک کرنے والے پر کوئی شرعی گرفت نہیں۔

---

۱ المحلی لابن حزم جلد ۷، صفحہ ۳۵۶۔۵۷۔ ۲ ایضاً صفحہ ۳۵۸

۳ کتاب الام جلد ۲، صفحہ ۱۸۹ ۴ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۱ صفحہ ۵۹۳

لیکن ہمارے ہاں ان احادیث کے بالکل برعکس اور عملِ صحابہؓ کے خلاف ہر آدمی سے قربانی کا لازمی مطالبہ کیا جاتا ہے۔

(۸) حج میں قربانی

قربانی کے متعلق جہاں تک قرآنی حکم کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ تم اسے حج کے موقعہ پر خانہ کعبہ لے جاؤ۔ (سورۃ الحج ۔ ۳۳) وہاں خود بھی کھاؤ اور بھوکے ضرورتمندوں کو بھی کھلاؤ ۔ (ایضاً آیت ۲۸) قرآنی تعلیمات اور خود صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی سب حاجیوں پر لازم نہ تھا بلکہ صرف صاحبِ استطاعت حضرات سے اس کی توقع کی جاتی تھی ۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ مسلک تھا ۔

عن ابراھیم وکان عمر یحج ولا یضحی وکان اصحابنا یحجون معھم الورق والذھب فلا یضحون۔ [۱]

(ترجمہ) ابراہیم سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ حج کرتے تھے لیکن قربانی نہیں دیتے تھے۔ اس طرح ہمارے بہت سے اصحاب جو فریضہ حج ادا کرتے تھے لیکن سونا چاندی ہونے کے باوجود قربانی نہیں کرتے تھے۔

امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

ورخص مالک للحاج فی ترکھا لمنی [۲]

(ترجمہ) امام مالکؒ نے حج کرنے والے کے لئے منیٰ کے مقام پر قربانی ترک کر دینے کی رخصت دی ہے۔

لیکن آج اگر کوئی اس بات کو دہرا دے تو اس پر فوراً منکرِ حدیث کا فتویٰ جڑ دیا جاتا ہے۔

(۹) عیدین کے خطبے

عیدین کے خطبے کے متعلق بخاری شریف اور مسلم کی ایک متفقہ حدیث یہ ہے کہ عید کے دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں داخل ہوتے تھے تو فوراً نماز شروع کرا دیتے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں کو خطبہ دیتے۔ یہ مشہور حدیث چونکہ آج بھی ہمارے مولوی حضرات تسلیم کرتے ہیں اس لئے ہم اسے نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز نماز عید تھی۔ خطبہ کے متعلق آپ کا فرمان یہ تھا کہ جس

---

[۱] المحلی لابن حزم ۔ جلد ۷ صفحہ ۳۷۵ ۔ [۲] بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۳۴۷

کی مرضی ہو وہ اسے سن لے اور جس کا جی چاہے چلا جائے (یعنی یہ خطبہ نماز عید کا حصہ نہیں) اس بارے میں حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وعن عطاء عن عبد اللہ بن السائبؓ قال شھدت مع النبیّ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم العید ۔ فلمّا قضی الصلوٰۃ قال انا نخطب فمن احبّ ان یجلس للخطبۃ فلیجلس ومن احبّ ان یذھب فلیذھب۔ رواہ النسائی وابن ماجہ وابوداؤد[1]

(ترجمہ) حضرت عطاء عبداللہ بن السائبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز عید ادا کی۔ نماز ختم کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اب ہم خطبہ دیں گے پس جو خطبہ سننے کے لئے بیٹھنا پسند کرے وہ بیٹھا رہے اور جو جانا چاہے چلا جائے۔

یعنی نماز عید کے بعد خطبہ سننا لازمی نہ تھا اور سلف الصالحین خطبہ سے پہلے کسی امام کو ایک لفظ تک نہیں بولنے دیتے تھے مروان کے زمانے میں جب لوگ عید کے بعد ان کا خطبہ سنے بغیر چلے جاتے تھے تو اس نے عید سے پہلے لوگوں کو کچھ خطاب کرنے کی کوشش کی تو حضرت ابوسعیدؓ نے اسے پکڑ کر منبر سے نیچے اتار دیا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں — فجبذت بثوبہ فجبذنی[2] — میں نے اسے کپڑوں سے کھینچ لیا اور اس نے مجھے کھینچ لیا۔

آج بھی وہی صورت حالات ہے۔ لوگ حتی المقدور ان حضرات کے خطبوں سے بھاگتے ہیں۔ لیکن ان حضرات نے حدیث کے بالکل برعکس نہ صرف نماز عید کے بعد کے خطبہ کا لوگوں کو شرعی لحاظ سے پابند کر رکھا ہے بلکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف نماز عید سے پہلے بھی لازماً لمبا چوڑا خطاب کرتے ہیں۔ قارئین ہی فیصلہ کریں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا انکار کون کر رہا ہے؟

(۱۰) محراب مسجد

آج کل ہماری مساجد میں امام کی نماز کے لئے جو محرابیں بنی ہوتی ہیں، ان کا صدر اسلام میں کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم امامت کے لئے اگلی صف میں کھڑے ہوتے اور دوسری میں صحابہؓ۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یقف وحدہٗ ویقف الصف الاول خلفہٗ ۔[3]

---

[1] نیل الاوطار۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۲۴۔ [2] ایضاً ص۳۲۳

[3] المحلی لابن حزم۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۲۹

(ترجمہ) حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک صف میں اکیلے کھڑے ہوتے اور آپ کے پیچھے پہلی صف بنائی جاتی۔

اصل میں یہ محرابیں عیسائی عبادت گاہوں میں ہوا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے مساجد میں اس کا اضافہ کر دیا تھا لیکن حضرت علیؓ خود اس کو ناپسندیدہ اور مکروہ فعل قرار دیتے تھے۔ ان سے منقول ہے:۔

وعن علی ابن ابی طالب انّہ کان یکرہ المحراب فی المسجد - (ایضاً)

(ترجمہ) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ مسجد میں محراب مکروہ سمجھتے تھے۔

صحابہ کرامؓ نے جب مساجد میں ان اضافوں کو دیکھا تو اسے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم مصیبت قرار دیا۔ اور فرمایا:۔

وعن کعب یکونُ فی آخرالزمانِ قومٌ تنقصُ اعمارھُم یزینون مساجدَھُم و یتخذُون لھا مذابحَ کمذابحِ النصاریٰ فاذا فعلوا ذالک صبت علیھمُ البلاء وھو قولُ محمد بن الجریرالطبری وغیرہ۔ ؎[1]

(ترجمہ) حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ آخری زمانے میں ایک قوم ہوگی جن کی عمریں کم ہوں گی اور وہ اپنی مساجد کو سجائیں گے اور ان میں نصاریٰ جیسی قربان گاہیں یعنی محرابیں بنائیں گے جب وہ ایسا کریں گے تو ان پر بلا نازل ہو جائے گی۔ محمد بن جریر الطبری اور کئی دوسرے فقہا کا بھی یہی مسلک ہے۔

لیکن آج کون سی مسجد ہے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور سلف الصالحین کے عمل کے بالکل الٹ محراب سے خالی ہو۔ معلوم نہیں یہ حضرات حدیث مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَیْسَ عَلَیْہِ اَمْرُنَا فَھُوَ رَدٌّ۔ کی کیا تاویل کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

؎[1] المحلی لابن حزم - جلد ۴ - ص ۲۳۹

جملہ حقوق محفوظ

مطالب الفرقان

اٹھائیسواں پارہ

سُورَۃُ المُجَادلۃ (۵۸)

(۱) اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے۔ جو تجھ سے (اے رسول!) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی، اور اپنی مظلومیت کے متعلق اپنے خدا سے فریاد کر رہی تھی (اس نے عدالتِ خداوندی میں استغاثہ دائر کیا تھا) اللہ تم دونوں کے سوال وجواب کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے (اب اس بارے میں خدا کا فیصلہ سن لو)

(۲) بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو (جہالت کی وجہ سے غصہ میں) ماں کہہ دیں، وہ ان کی سچ مچ کی مائیں نہیں بن جاتیں (اس لئے محض ایسا کہہ دینے سے انہیں ان پر حرام نہیں ہو جانا چاہیئے) ان کی مائیں وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے ($\frac{۳۳}{۴}$)۔ جو لوگ غصہ میں آکر اس قسم کی بات کہہ دیتے ہیں تو یہ بیہودگی اور لغویت ہوتی ہے، اور حقیقت کے بالکل خلاف۔ سو، خدا کا قانون یہ ہے کہ اس قسم کی لغویات سے درگذر کیا جائے (اسے حقیقت پر محمول کر کے، بیوی کو اس پر حرام نہ قرار دے دیا جائے)۔ اور اس طرح، ان لغویت کے تباہ کن نتائج سے انہیں محفوظ رکھا جائے۔

(۳) لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ معاشرہ میں اس قسم کی لغویتوں کو عام ہونے دیا جائے۔ سنجیدہ لوگوں کا معاشرہ ایسا نہیں ہوا کرتا۔ لہذا) جو لوگ اپنی بیوی کو ماں (یا ایسے ہی کوئی اور الفاظ) کہہ بیٹھیں، اور اس کے بعد پشیمان ہو کر، اپنی اس بیہودہ بات کو واپس لینا چاہیں، (تو انہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے

آپ پر تابو رکھنا سیکھیں اور یونہی جو جی میں آئے، زبان سے نہ نکال دیا کریں۔ وہ جرمانہ یہ ہے کہ (قبل اس کے کہ وہ بہ حیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس جائیں) ایک غلام آزاد کریں۔ یہ اس لئے ہے کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو۔ اور اللہ تمہارے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

(۴) جس کے پاس غلام نہ ہو، یا غلام آزاد کرانے کی استطاعت نہ ہو (یا اُس زمانے کے غلاموں کے ختم ہو جانے کے بعد، جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں، وہ، تعلقات زناشوئی سے پہلے دو ماہ کے متواتر روزے رکھے۔ اور اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لئے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی بات مانو جو اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔

یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں، جن کے اندر رہنا ضروری ہے۔ (اگر اس باب میں سہواً غلطی ہو جائے تو اس کے ازالہ کی شکل وہ کفارہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے ان حدود ہی کا انکار کریں تو وہ کافر ہیں) اور کافروں کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

(۵) جو لوگ اس طرح، نظامِ خداوندی سے انکار، اور اس کی مخالفت کرتے ہیں، وہ آخر الامر ذلیل و خوار ہوں گے، جس طرح وہ لوگ ذلیل و خوار ہوئے جو ان سے پہلے، اسی طرح حق کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنے قوانین واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ان کی مخالفت کرنے والوں کے لئے ذلت آمیز تباہی ہے۔

(۶) جس دن خدا ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا، پھر انہیں ان کے اعمال (کے نتائج) سے آگاہ کریگا، لوگ تو بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا، لیکن خدا کا قانونِ مکافات، ہر بات کو محفوظ رکھتا ہے سب کچھ اس کے سامنے رہتا ہے۔

(۷) کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا کو اس کا علم ہے۔ اگر کہیں کوئی تین آدمی خفیہ مشورہ کرتے ہیں تو ان میں چوتھا خدا ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہوتی ہے تو ان میں چھٹا خدا ہوتا ہے۔ (یہ اعداد تو محض مثالاً بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ) ان سے کم ہوں یا زیادہ۔ جہاں کہیں، اور جتنے بھی وہ ہوں، خدا ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے — پھر وہ ان اعمال کے نتائج کے ظہور کے وقت، انہیں ان سے باخبر کر دیتا ہے۔ یقیناً خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔

(۸) کیا تو نے ان لوگوں کے متعلق غور نہیں کیا جنہیں خفیہ مشوروں سے روکا گیا تھا، لیکن وہ پھر وہی کچھ کرتے ہیں۔ یعنی وہ مختلف قسم کے جرائم کے ارتکاب کے لئے خفیہ مشورے کرتے رہتے ہیں۔ ان میں

ایسے جرائم بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق ان کی ذات تک محدود ہوتا ہے، اور وہ بھی جن کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نظامِ خداوندی کے خلاف بھی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ (یہ سب کچھ منافقت سے کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ) جب تیرے پاس آتے ہیں تو (ہلکی آوازیں، مبہم طور پر) ایسے الفاظ میں تجھ سے دعا سلام کرتے ہیں، جو الفاظ سلام اور دعا کے لئے خدا نے تجویز نہیں کئے۔ پھر اپنے دل میں کہتے ہیں کہ (اگر اللہ سب کچھ جانتا ہے تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ (انہیں کیا معلوم کہ خدا نے ان کے لئے جو جہنم تیار کر رکھا ہے وہ ان کے عذاب کے لئے کافی ہے۔ وہ اس میں داخل کئے جائیں گے (اور دیکھ لینگے کہ) وہ کیسا بُرا ٹھکانہ ہے۔

(۹) اے جماعتِ مومنین! جب تم نے باہمی مشورے کرنے ہوں، تو جرائم کے ارتکاب اور نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی کے مشورے مت کرو۔ ہمیشہ بھلائی اور تقوے (قوانینِ خداوندی کی نگہداشت) سے متعلق امور میں مشورے کرو۔ مختصراً یہ کہ تم ہر معاملہ میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اس لئے کہ وہی تمہاری تمام سعی و عمل کا مرکز، اور تگ و تاز کا منتہیٰ ہے۔ تمہاری گردش اسی محور کے گرد ہونی چاہیئے۔

(۱۰) یاد رکھو! منافقین کے مشوروں کے محرک، ان کے مفاد پرستانہ جذبات ہوتے ہیں جو انہیں سرکشی پر ابھارتے رہتے ہیں۔ مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ اس سے جماعتِ مومنین افسردہ دلگیر ہو جائے۔ لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ وہ (انہیں (جماعتِ مومنین کو) کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لئے کہ نفع یا نقصان قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور جماعت مومنین ان قوانین کا پورا پورا خیال رکھتی ہے، اس لئے اس قسم کی حرکات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ انہیں قوانینِ خداوندی پر کامل اعتماد ہے۔

(۱۱)۔ (اے جماعتِ مومنین! یہ منافقین جب تمہاری مجلس میں آتے ہیں تو باہمی سرگوشیوں کے لئے، ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کشادہ ہو کر بیٹھو، تو فوراً ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیٹھ جایا کرو۔ (اس طرح انہیں بھی ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں، خود تمہاری جماعت میں بھی کسی کو یہ شبہ پیدا نہیں ہوگا کہ اس کے خلاف کوئی سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ مجلس میں بیٹھنے کا عام انداز ایسا ہی ہونا چاہیئے) اس سے اللہ تعالےٰ تمہارے لئے کشادگی کی راہیں کھول دے گا۔ اور جب کہا جائے کہ مجلس برخاست ہوتی ہے اس لئے تم اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ (یہ باتیں بظاہر چھوٹی چھوٹی سی ہیں لیکن ان کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں، اس لئے ان کی پابندی سے) اللہ تمہارے درجات بلند کرے گا جو دل سے ان باتوں کو صحیح اور سچا مانتے ہیں اور ان کی حکمت و غایت کا علم رکھتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانون مکافات تمہارے تمام اعمال سے باخبر رہتا ہے۔

(۱۲) اے جماعتِ مومنین! اگر تم نے رسولؐ سے علیحدگی میں کوئی بات کرنی ہو تو پہلے، اپنی استطاعت کے مطابق، منفعتِ عامہ کے لئے کچھ بطور عطیہ دے دیا کرو۔ یہ چیز تمہارے لئے بڑی مفید رہے گی اور اس سے کئی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ (اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ یہ منافقین جو گھڑی گھڑی رسول اللہ سے علیحدگی میں بات کرنے کا تقاضا کرتے ہیں، اس سے رُک جائیں گے)۔ لیکن اگر تمہارے پاس کسی وقت کچھ دینے کے لئے نہ ہو، تو خیر۔ (تم رسول سے یہ بات کہہ دیا کرو)۔ اللہ کے قانون میں ایسے مواقع کے لئے رعایت رکھ دی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے مقصد تمہاری حفاظت اور ربوبیت ہے۔ تم پر سختی کرنا مقصود نہیں)۔

(۱۳) تمہیں، اس حکم سے، کہ رسول کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے سے پہلے، کچھ عطیہ دے دیا کرو، گھبرانا نہیں چاہیئے۔ (اس سے تمہارے رسول کا بہت سا قیمتی وقت، جسے لوگ فضول باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں، بچ جائے گا۔ باقی رہے وہ لوگ جن میں کچھ ادا کرنے کی استطاعت نہیں، تو ان کے لئے اس حکم میں پہلے ہی رعایت رکھ دی گئی ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی تدابیر کی ضرورت تنظیم کے ابتدائی مراحل میں پڑتی ہے۔ تم نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے کے لئے پوری پوری جدوجہد کرو——اس نظام میں باہمی مشوروں کا انداز ہی اور ہوتا ہے (۴۲/۳۸)۔ اور انسانیت کی نشوونما بہم پہنچانے کا اہتمام کرو۔ اس مقصد کے لئے تم نظامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرو۔ پھر اس قسم کی احتیاطی تدابیر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یاد رکھو! خدا تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

(۱۴) اس وقت ان تدابیر کی ضرورت اس لئے ہے کہ تمہارے اندر منافقین آگھسے ہیں جو تمہارے نظام کے لئے بڑے خطرے کا موجب ہیں) ان کی حالت یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کے رشتے جوڑتے ہیں، جو نظامِ خداوندی کی مخالفت اور سرکشی کی وجہ سے مجرم اور سزا کے مستحق قرار پا چکے ہیں۔ یہ نہ تو نیک نیتی سے تمہارے ساتھ شامل ہوتے ہیں، اور نہ ہی کھل کر تمہارے مخالفین کے ساتھ۔ وہ جھوٹی قسمیں کھا کھا کر تمہیں اپنے اخلاص اور صداقت کا یقین دلاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ دیدہ و دانستہ کرتے ہیں۔

(۱۵) ان کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے، سخت سزا مقرر ہے۔ اس لئے کہ ان کی یہ روش نہایت مذموم ہے۔

(۱۶) یہ اپنی جھوٹی قسموں کو سپر بناتے ہیں، اور ان کے پیچھے پناہ لے کر، لوگوں کو نظامِ خداوندی کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ ان کے لئے ذلت آمیز سزا ہوگی۔

(۱۷) یہ جس مال و دولت کے گھمنڈ، اور جن افرادِ خاندان کے برتے پر یہ کچھ کرتے ہیں، خدا کے

قانونِ مکافات کے مقابلہ میں' یہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ یہ تباہی اور بربادی کے جہنم میں داخل ہوں گے اور اسی میں رہیں گے۔

(۱۸) جس دن اللہ' ان سب کو سامنے لا کر (بے نقاب) کھڑا کرے گا' تو اس وقت بھی یہ اس کے سامنے اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح آج تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں' اور سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمیں ان کا اعتماد قائم رکھتی ہیں۔ اور وہ اپنی فریب دہی میں بڑے کامیاب ہیں۔ (لیکن خدا کے سامنے یہ بات کیسے چل سکے گی۔ اس کا قانونِ مکافات دلوں کے راز تک سے واقف ہوتا ہے)۔ یاد رکھو! یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں۔

(۱۹) بات یہ ہے کہ مفاد پرستیوں کے سرکش جذبات ان پر بری طرح سے مسلط ہو چکے ہیں۔ وہ انہیں ہانکتے چلے جاتے ہیں' اور یہ' اُن کے ڈنڈے کے زور پر' اس روش پر چلے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے' انہوں نے ضابطہ خداوندی کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ یہ لوگ شیطانی پارٹی کے افراد ہیں ـــ اور اسے اچھی طرح سمجھ رکھو' کہ شیطانی پارٹی ہمیشہ خاسر و نامراد رہتی ہے۔

(۲۰) سوچو تو سہی' کہ جو لوگ اس قسم کے نظامِ خداوندی کی مخالفت کریں جو نوعِ انسان کی بہبود کے لئے قائم ہو رہا ہو' وہ کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں؟ وہ آخر الامر سخت ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

(۲۱) خدا کا فیصلہ (قانون) یہ ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں' حق غالب آئے گا اور اس کے علمبردار یعنی خدا کے رسول' مظفر و منصور ہوں گے۔ یہ اُس خدا کا فیصلہ ہے جو ہر قسم کی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ دنیا کی کوئی قوت اس کے قانون کو شکست دے سکے۔

(۲۲) لہٰذا جب حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل' ایک دوسرے کی ضد اور باہدگر متخالف ہیں' تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ خدا کے قانون اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کریں' جو نظامِ خداوندی کے مخالف ہوں' خواہ وہ ان کے (ماں)' باپ' یا بیٹے (بیٹیاں) یا بھائی (بہن) یا اُن کے خاندان کے دوسرے افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ ($\frac{۲}{۱۱۴}$; $\frac{۹}{۲۴}$) یہ (افرادِ مومنین) وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں منقوش ہو چکا ہے اور خدا کی وحی (قرآن) ان کی تائید و نصرت کی موجب بن رہی ہے۔ یہ (اس زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی) اُس جنتی معاشرہ میں داخل ہوں گے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیا تو قوانینِ خداوندی کے ثمرات و برکات' یقیناً ان کے ہم رکاب رہیں گے۔

یہ ہے (شیطان کی پارٹی کے مقابلہ میں) خدا کی پارٹی ـــ یاد رکھو: آخر الامر کامیابی اور کامرانی خدا کی پارٹی کے حصے میں ہی آتی ہے۔ حق غالب آ کر رہتا ہے۔

(۰)

سُورۃ الحَشر (۵۹)

(۱) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اُس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کی قوت "اندھی نظرت" کی قوت نہیں۔ وہ یکسر حکمت پر مبنی ہے۔

(۲) اُس کے قانونِ مکافات کی قوت اور غلبہ کے آثار میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ان اہلِ کتاب (یہود) کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان لوگوں نے نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی اختیار کی اور جنگ تک کی نوبت آگئی۔ (انہیں اپنی قوت پر بڑا ناز تھا، لیکن ہوا یہ کہ) ابھی پہلا ہی لشکر ان کے مقابلہ کے لئے گیا تھا کہ انہوں نے میدان چھوڑ دیا۔ (اس پر انہیں ایک اور موقعہ دیا گیا کہ وہ فتنہ و فساد سے باز آکر اپنی اصلاح کرلیں۔ چنانچہ ان کے خلاف اور کوئی کارروائی نہ کی گئی بجز اس کے کہ بطور حفظِ ماتقدم) انہیں اُن کی اُس بستی سے نکال کر دوسری جگہ آباد کر دیا گیا۔

تمہیں اس کا خیال تک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس آسانی سے اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔ خود انہیں بھی اپنے قلعوں کی مضبوطی پر بڑا ناز تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ قلعے، تمہارے حملے سے اُن کی حفاظت کریں گے لیکن، خدا کا قانونِ مکافات، اُن پر ان راہوں سے آگیا جن کا انہیں سان گمان بھی نہ تھا۔ چنانچہ، اُن کے دل میں تمہارا ایسا رعب طاری ہو گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے، اپنے گھر ویران کرنے لگ گئے، اور (جنہوں نے کچھ مزاحمت کی) اُن کی خانہ ویرانی تمہارے ہاتھوں سے عمل میں آگئی۔

اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے اس واقعہ میں ہزار سامانِ عبرت ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق کی مخالفت کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

(۳) اگر اُن کے لئے اس جلا وطنی کا فیصلہ نہ کیا جاتا، تو انہیں بڑی ہی سخت سزا دی جاتی۔ یہ سزا انہیں اسی دنیا میں مل جاتی۔ باقی رہی اُخروی زندگی، سو اس میں ان کے لئے بڑا تباہ کن عذاب ہوگا۔

(۴) یہ اس لئے کہ انہوں نے اُس نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی اختیار کی جسے (نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے) اس کا رسول قائم کر رہا تھا۔ (ہر ایک کو سن رکھنا چاہیئے کہ) جو شخص بھی اس نظامِ حق و انصاف کے خلاف سرکشی اختیار کرے گا، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ یہ قانون مجرمین کا پیچھا نہیں چھوڑا کرتا۔

(۵) تم نے (محاصرہ کے وقت جنگی ضروریات کے تحت) ان کے جن کھجور... کے درختوں کو کاٹ ڈالا یا جنہیں ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو تم نے یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق کیا جس کی رُو سے اس نے تمہیں ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دے رکھی ہے (۵۹/۲۲) مقصد اس سے یہ ہے کہ جو لوگ غلط راہوں پر چلیں وہ دیکھ لیں کہ اس طرح انہیں کس قدر ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔

(۶) اور اس لشکر کشائی میں، مخالفین کا جو ساز و سامان تمہارے ہاتھ آیا ہے، تو یہ بغیر جنگ کئے تمہارے قبضے میں آگیا ہے۔ اس کے لئے نہ تمہیں گھوڑے دوڑانے پڑے، نہ اونٹ ــــ اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے، اس طرح بھی مخالفین پر غلبہ و تسلط عطا کر دیا کرتا ہے۔ اللہ نے ہر شے کے اندازے مقرر کر رکھے ہیں، اور ان پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

(۷) دشمن کا جو مال و اسباب، اس طرح، بغیر جنگ کئے، ہاتھ آجائے، اس کی نوعیت عام مالِ غنیمت سے مختلف ہوتی ہے (۵۹/۶) یہ مال، سب کا سب، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ اسے ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے صرف کیا جائے ــــ مثلاً (جنگ میں شریک ہونے، اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار، تنہا رہ جانے والوں کے لئے، ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں، نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔ اسے اس طرح نہیں بانٹنا چاہیئے کہ یہ دولتمندوں کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے (اور محتاج اور غریب، اپنی ضروریاتِ زندگی تک سے بھی محروم رہ جائیں)۔ لہٰذا، اس کی تقسیم میں، جو کچھ تمہیں رسول، (مرکزِ نظامِ خداوندی) دے، اسے بطیبِ خاطر قبول کرو، اور جس مال سے تمہیں روکے، اس سے برضا و رغبت رک جاؤ (۵۹/۷)۔ تم ہر حال میں، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر سخت مواخذہ ہوتا ہے۔

(۸) اس مال میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جنہیں، ان کے گھروں سے باہر نکال دیا گیا اور جن کا مال و متاع اور ساز و سامان سب چھین لیا گیا۔ انہیں معاشی سہولتوں کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رہنے، اور نظامِ خداوندی کی ہر ممکن مدد کرنے کی آرزو بھی موجزن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دعوئے ایمان کو، اپنی قربانیوں سے سچ کر دکھایا۔ (اور اسی "جرم" کی پاداش میں، مخالفین نے ان پر اس قدر سختیاں کیں۔ (۶۰/۱)

(۹) دوسری طرف، وہ لوگ بھی اپنے دعوئے ایمان میں اسی طرح سچے ہیں جنہوں نے، ان لوگوں کی ہجرت سے پہلے ہی، اپنے ایمان کو مستحکم کر لیا تھا اور اپنے گھروں میں ان کے لئے جگہ بنا رکھی تھی۔ ان انصار

مدینہ) کی کیفیت یہ ہے کہ جو مومن بھی ہجرت کر کے ان کے پاس آتا ہے' یہ اُس سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں' اور انہیں (مہاجرین کو) جو کچھ بھی دیا جاتا ہے' اس کے متعلق ان کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہیں گذرتا کہ یہ انہیں ملنا چاہیئے تھا۔ یہ ہمیشہ' اِن آنے والوں کی ضروریات کو' اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ (یہی سچے مومنین کا شعار ہے)

یاد رکھو! جو لوگ اپنے اندر ایسی کیفیت پیدا کر لیں کہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے' دوسروں کو دھکا دے کر خود آگے نہ بڑھیں' بلکہ اگر دیکھیں کہ اُن کی پیاس کی شدت زیادہ ہے تو خود پیچھے ہٹ جائیں اور انہیں آگے بڑھ کر پیاس بجھا لینے دیں' تو یہی لوگ ہیں جن کی کھیتیاں سرسبز ہونگی۔

(۱۰)۔ (اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ ایسے نامساعد حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے' ان کے درجات بہت بلند ہیں۔ لیکن) جو لوگ ان کے بعد آئے ہیں' (ان کا ایمان بھی بڑا محکم ہے) ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو ہمارے لئے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لئے بھی' جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں۔ اور ہمارے دل میں کسی مومن کے لئے' ذرہ بھر کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ تو سب کے لئے حالات میں تری پیدا کرنے والا' اور سامانِ نشو ونما عطا کرنے والا ہے۔

(۱۱)۔ (یہ تو سچے مومنین کی حالت ہے۔ ان کے برعکس) تو نے منافقین کی حالت پر بھی غور کیا ہے؟ وہ اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کو' جنہوں نے نظامِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر رکھی ہے' اور جن کے ساتھ انہوں نے رشتۂ اخوت استوار کر رکھا ہے' کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اپنے گھروں سے نکالا گیا' تو ہم بھی تمہارے ساتھ یہاں سے نکل جائینگے' اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کے حکم اور فیصلہ کی پروا نہیں کرینگے۔ اور تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔

اور اللہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ اپنی اِن باتوں میں بھی جھوٹے ہیں۔ (اگر یہ اپنے دعوئے ایمان میں مخلص نہیں' تو اِن مخالفین کے ساتھ جن تعلقات کا اظہار کرتے ہیں' ان میں بھی سچے نہیں)۔

(۱۲) اگر ان اہل کتاب کو گھروں سے نکالا گیا تو یہ کبھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ نہیں جائینگے۔ اور اگر ان کے ساتھ تمہاری جنگ ہوئی تو یہ کبھی ان کی مدد نہیں کرینگے۔ اور اگر' طوعاً و کرہاً ان کی مدد کے لئے جائینگے بھی' تو عین لڑائی کے وقت' میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ لہٰذا' یہ اُن کی مدد نہیں ہوگی (اُلٹی مخالفت ہوگی)

(۱۳) ان (مخالفینِ یہود کو) جو خدا کے قانونِ مکافات سے اتنا عرصہ ڈرایا گیا تو ان کے دل

ہیں، اُس کا اتنا ڈر نہیں پیدا ہوا تھا جتنا ڈراب (تمہاری جمعیت اور لشکر کو دیکھ کر) پیدا ہوا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ (صرف محسوس اور مرئی قوت سے مرعوب ہوتے ہیں) حقائق اور قانون کی قوت کو نہیں سمجھتے۔

(۱۴) ان کے دل میں تمہارا رعب اس قدر ہے کہ) اگر یہ سب کے سب متحدہ محاذ بنا کر بھی تمہارے مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوں، تو بھی کھلے میدان میں تمہارے سامنے آکر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر پائیں گے۔ یہ، یا تو اپنی بستیوں کے قلعوں میں بیٹھ کر، یا شہر کی فصیل کی اوٹ میں، لڑائی کریں گے۔ یہ اس لئے کہ ان کی آپس میں باہمی لڑائی بڑی سخت ہے۔ یہ اگرچہ سب اکٹھے دکھائی دیتے ہیں (اور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بڑا اتحاد اور ائتلاف ہے) لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اگر یہ ذرا بھی عقل سے کام لیں (تو اس حقیقت کو بآسانی سمجھ لیں کہ اس قسم کا نمائشی اتحاد کبھی کامیابی کی راہ نہیں دکھایا کرتا۔ حقیقی اتحاد دلوں کا اتحاد ہے اور وہ صرف ایمان ـــ نصب العین کی ہم آہنگی ـــ سے پیدا ہو سکتا ہے اور اسی میں حقیقی قوت کا راز مضمر ہوتا ہے)

(۱۵) ان کی کیفیت بھی انہی (یہود) کی سی ہے جنہیں ابھی ابھی، ان کے کئے کی سزا ملی ہے (۵/۹) سو جسطرح انہیں الم انگیز عذاب میں مبتلا ہونا پڑا تھا، اسی طرح ان کا بھی حشر ہوگا۔

(۱۶) باقی رہے ان کے یہ حمایتی، یعنی منافقین جو ان سے مدد کرنے کے دعوے کر رہے ہیں، تو) ان کی حالت اُس شیطان کی سی ہے جو پہلے تو انسان سے کہہ دیتا ہے کہ حق سے انکار کر دے، اور جب وہ اس سے انکار کر دیتا ہے اور اس انکار کے نتائج سامنے آتے ہیں تو) وہ الگ جا کھڑا ہوتا ہے۔ اور صاف کہہ دیتا ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ میں تو اپنے اللہ، رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ (سطحی جذبات کا اتباع کرنے والوں کیساتھ یہی کچھ ہوتا ہے)

(۱۷) سو ان دونوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ جہنم دینے والے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی ظلم اور زیادتی کرتے ہیں، ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

(۱۸) اے جماعتِ مومنین! (دیکھنا کہیں تم میں ایسی کیفیت نہ پیدا ہو جائے) تم ہر حالت میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور (انفرادی مفادِ عاجلہ سے صرفِ نظر کر کے) ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو کہ تم نے مستقبل کی خوشگواریوں کے لئے کیا کیا ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ تم ہر حال میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر کام سے باخبر ہے۔ (وہ کبھی کسی کے عمل کو رائگاں نہیں جانے دیتا)۔

(۱۹)۔ (تم اس حقیقت کو یاد رکھو کہ مقصودِ حیات، صرف انسان کی طبیعی زندگی کی پرورش نہیں، اس

کی ذات کا ارتقاء اور بالیدگی بھی مقصود ہے۔ بلکہ بنیادی مقصد یہی ہے۔ طبیعی زندگی تو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ مقصد قوانینِ خداوندی کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہذا) تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ (اور ان کی زندگی حیوانی سطح کی زندگی بن کر رہ گئی۔ وہ "میں" کو بھلا بیٹھے اور ان کا منتہائے مقصود "میرا" رہ گیا) یہی لوگ ہیں جو صحیح راستے سے ہٹ کر غلط راہوں پر جا پڑتے ہیں۔

(۲۰) یاد رکھو! تربیت و استحکامِ ذات کا نام جنت کی زندگی ہے اور اسے فراموش کر دینا جہنم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جنت میں رہنے والے، اور جہنمی کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کامیابیاں اور کامرانیاں صرف اہلِ جنت کے حصے میں آتی ہیں۔

(۲۱)۔ (اور یہ جنت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ قرآن تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اس قرآن کی اثر انگیزیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر مثال کے طور پر) ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے) تو تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور ذمہ داریوں کے خیال سے اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اس قسم کی مثالیں ہم اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ یہ قرآن کن عظمتوں کا مالک ہے۔

(۲۲) اور یہ ان عظمتوں کا مالک ہو کیوں نہ؟ یہ اُس خدا کی کتاب ہے جس کے سوا کائنات میں کسی اور کا اختیار اور اقتدار نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حاضر و غائب، سب کا علم بھی رکھتا ہے۔ (وہ ہر شے کے متعلق جانتا ہے کہ اس کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس کے مضمر ممکنات کیا کیا ہیں۔ وہ کیا کچھ بننے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ یاد رکھو! یہ "غیب و شہادت" کا امتیاز، انسانی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ ورنہ خدا کے نزدیک سب مشہود ہی مشہود ہے) ان صلاحیتوں کی برومندی کے لئے جس قدر سامانِ نشو و نما کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔

(۲۳) ہاں اسی خدا کی طرف سے جس کے سوا کائنات میں کسی اور کا اقتدار اور اختیار نہیں، ساری کائنات اسی کی مملکت ہے۔ اس میں اس کے سوا کسی کا قانون کارفرما نہیں۔ اس کے اقتدار اور علم کی وسعتیں لاانتہا ہیں۔ اس کی ذات مکمل ترین اور ہر نقص سے پاک ہے اور وہ ہر ایک کو تکمیلِ ذات کے سامان عطا کرتا ہے وہ کائنات کو تخریبی قوتوں کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اور کوئی شے اس کی نگہبانی کے دائرے سے باہر نہیں اسے ہر شے پر غلبہ اور تسلط حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کی قوت رکھتا ہے

اس نے ہر شے کو اس طرح اپنے قانون کی جابر (جکڑبندوں[1]) میں باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتیں، اور اس طرح نظامِ کائنات میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ عظمت و کبریائی سب اُسی کے لئے ہے۔ وہ اس سے بہت دور ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کی قوت اور اقتدار کو بھی شریک سمجھا جائے۔

(۲۴) وہ خدا ہر شے کا خالق ہے۔ اس کے عملِ تخلیق کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی پیدائش، اسکے نقطۂ آغاز سے کرتا ہے۔ پھر اسے مختلف ارتقائی مراحل سے اس طرح گذارتا ہے کہ غیر ضروری عناصر اس سے چھٹ کر الگ ہوجاتے ہیں تا آنکہ وہ ایک خاص صورت اختیار کرلیتی ہے جو اسے دیگر اشیاء سے متمیز کر دیتی ہے (اس مرحلہ پر تم کہتے ہو کہ وہ شے وجود میں آگئی)۔

یہ چند ایک صفات ہیں، ذاتِ خداوندی کی جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ تمام بلند صفات، اپنی حسین ترین اور مکمل ترین شکل میں، اس کی ذات میں مجتمع ہیں۔ پھر اس کا نظام ایسا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب اس کے پروگرام کی تکمیل کیلئے سرگرمِ عمل ہے — وہ ہر قسم کے غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔

(یہ ہے وہ خدا جس کی کتاب، قرآن کریم ہے۔ ظاہر ہے کہ جو خدا ان صفات کا مالک ہو اس کی کتاب کن عظمتوں کی حامل ہوگی۔ اور جو قوم اس کتاب پر عمل کرے گی اس میں یہ صفاتِ خداوندی، علیٰ حدِ بشریت، کس حسن و زیبائی سے جلوہ ریز ہوں گی۔ اور وہ نوعِ انسانی کے لئے کس درجہ امن و سلامتی کی ضامن ہوگی!)

——— (۲۴) ———

سُورَۃُ المُمۡتَحِنَۃ - (۶۰)

(۱) اے جماعتِ مومنین! تم نظامِ خداوندی کے دشمنوں کو، جو خود تمہارے بھی دشمن ہیں، کبھی دوست نہ بناؤ (۶۰/۱) یعنی ایسا کبھی نہ کرو کہ تم ان سے محبت اور یگانگت کے تعلقات قائم کرو، درآں حالیکہ وہ اس ضابطۂ دین کی مخالفت کر رہے ہیں جو تمہارے پاس خدا کی طرف سے آیا ہے۔ تمہارے لئے معیارِ تعلقات دین ہونا چاہیئے نہ کہ ذاتی رجحانات یا رشتہ داریاں۔ (۶۰/۹-۱۳، ۴) ان کی دشمنی کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے

[1] (SPLINTS) جن سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو باندھا جاتا ہے تاکہ وہ جُڑ جائیں۔

نہیں، اور تمہارے رسول کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا، محض اس جرم کی بنا پر کہ تم اپنے نشوونما دینے والے ۔۔۔ اللہ ۔۔۔ پر ایمان لاتے ہو! تم سوچو کہ کیا یہ دو باتیں کبھی یکجا ہو سکتی ہیں کہ تم ایک طرف تو میرے قانون کا اتباع کرتے ہوئے، اس نظام کے قیام کے لئے جہاد کرنے کو نکلو، اور دوسری طرف، ان دشمنوں سے دربردہ، دوستی کے تعلقات بھی استوار کرو؟ یاد رکھو! تم جو کچھ چھپاؤ یا ظاہر کرو، وہ سب ہماری نگاہ میں ہے۔ سو تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا، وہ زندگی کی سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔

(۲) یہ لوگ اگر تم پر کبھی قابو پالیں تو پھر دیکھو کہ ان کی دشمنی کا کیا عالم ہے، اور یہ تمہیں اپنی زبانوں سے اور ہاتھوں سے کس کس قسم کی اذیت پہنچاتے ہیں۔ ان کی دلی تمنا یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح تمہیں دین سے منحرف کر کے، پھر سے اپنے جیسا بنا لیں۔

(۳) یہ ٹھیک ہے کہ ان لوگوں سے تمہارے خون کے رشتے ہیں، لیکن یاد رکھو، اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت، تمہارے رشتے دار حتیٰ کہ تمہاری اولاد تک بھی تمہارے کسی کام نہیں آسکے گی۔ اس وقت تم میں اور ان میں نمایاں بُعد ہو گا۔ تمہارے کام، صرف تمہارے اعمال آئیں گے جنہیں خدا اچھی طرح دیکھتا ہے۔

(۴) یہ بات سمجھنے کے لئے (کہ دینِ خداوندی کے مقابلہ میں رشتہ داری کے تعلقات کی حیثیت کیا رہ جایا کرتی ہے) تمہارے لئے، ابراہیمؑ، اور اس کے رفقاء کا طرزِ عمل، نہایت عمدہ نمونہ ہے جو تمہارے دلوں کی کشمکش دور کر کے، ان میں سکون اور اطمینان پیدا کر دے گا۔ (۲۱/۳۳) انہوں نے اپنی قوم سے (جن سے ان کے خون کے رشتے تھے) علانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے، اور جن کی تم نے، خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے، سخت بیزار ہیں (۶۰/۴) ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر تم میں اور ہم میں، ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی، تاآنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔ ۱۱۲/۳ ؛ ۲۲/۵۸)۔ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے یہ ضرور کہا تھا کہ میں خدا سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں ایمان عطا کرے، تمہاری حفاظت کا سامان فراہم کر دے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو میں، خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا کیونکہ مجھے، یا کسی اور کو، اس کی مقدرت ہی حاصل نہیں۔ (چنانچہ جب وہ ایمان نہ لایا تو ابراہیمؑ نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ ۹/۱۱۴ ؛ ۱۹/۴۷)

ان لوگوں نے، اپنی قوم کی قوت و سطوت کی پروا نہ کرتے ہوئے، ان سے اپنے تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اپنے نشوونما دینے والے (اللہ) سے کہہ دیا کہ تیرے قانون کی صداقت اور حکمیت

پر ہمارا پورا پورا بھروسہ ہے۔ ہم ان سب سے منہ موڑ کر خالصتہً تیرے قوانین کا اتباع کرتے ہیں اور سفرِ زندگی میں ہمارا ہر قدم تیری ہی طرف اُٹھے گا۔ یہی ہمارا منتہیٰ ہے۔

(۵) اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے نشو ونما دینے والے سے یہ درخواست بھی کی کہ ایسا نہ ہو جائے کہ ہم ان لوگوں کا تختۂ مشق بن جائیں جو تیرے دین سے انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے تو ہمیں سامانِ حفاظت عطا فرما۔ تو ہر ایک پر غالب اور بڑی حکمتوں کا مالک ہے۔

(۶) یہ تھا ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں کا وہ طرزِ عمل جس میں ہر اس شخص کے لئے پیروی کا عمدہ نمونہ ہے جو خدا کے قانونِ مکافات ــــ یعنی مستقبل کی زندگی ــــ پر یقین رکھتا ہو۔ جو شخص اس طرزِ عمل سے روگردانی اختیار کرے گا، تو اس سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ اس سے بے نیاز ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ وہ اپنی ذات میں جملہ ستودہ صفات کا مالک ہے۔

(۷) تم جلدی نہ کرو۔ وہ ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اس وقت تمہاری دشمنی ہے، ان میں اور تم میں محبت اور یگانگت کے تعلقات پیدا ہو جائیں۔ (یعنی وہ ایمان لے آئیں اور اس طرح تمہارے دینی بھائی بن جائیں)۔ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کئے ہوئے اندازوں (قوانین) کے مطابق ہوتا ہے۔ انہی اندازوں کے مطابق تمہیں سامانِ حفاظت اور متاعِ نشو ونما ملتی ہے۔

(۸)۔ (اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ) خدا تمہیں اس بات سے ہرگز نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں، جنگ نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، تم ان سے (محض اس بنا پر کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے) کشادہ ظرفی کا سلوک کرو اور عدل و انصاف سے پیش آؤ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۵/۸) عدل و انصاف تو ان دشمنوں تک سے بھی کیا جائے گا۔ جو تمہارے خلاف، جنگ کرنے کے لئے نکل آئیں۔ اس لئے کہ) اللہ، انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (باقی رہے وہ جنہوں نے تمہارے خلاف جنگ نہیں کی، تو ان سے، عدل و انصاف سے آگے بڑھ کر، حسنِ سلوک سے بھی پیش آؤ)۔

(۹) قانونِ خداوندی تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے خلاف دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے۔ یا جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے یا ایسا کرنے والوں کی مدد کی ہے، تم ان لوگوں سے محبت اور یگانگت کے تعلقات مت قائم کرو۔ جو لوگ ان سے دوستانہ تعلقات قائم کریں گے، وہ مجرم قرار پائیں گے۔

(۱۰) اب ایک اور شق کی طرف آؤ۔ اس وقت بہت سی مسلمان عورتیں، مکہ سے ہجرت کر کے تمہارے

طرف آرہی ہیں۔ جب یہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے حالات کی تحقیق کر لیا کرو۔ اللہ تو جانتا ہے کہ ان میں سے کون کون سچے ایمان کے ساتھ تمہاری طرف آرہی ہیں (لیکن تم تو تحقیقات کے بغیر صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے اسے محض اللہ پر نہ چھوڑو، خود بھی تحقیق کر لو) اس تحقیق کے بغیر اگر تم دیکھو کہ وہ واقعی ایمان کی پختگی کے ساتھ آئی ہیں، تو پھر انہیں کفار کی طرف مت لوٹاؤ۔ اس لئے کہ یہ اسلام لے آئی ہیں۔ اور ان کے شوہر کافر ہیں۔ اور ایک مومن عورت کافر مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی جس طرح ایک مومن مرد کا نکاح، کافر عورت سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، نہ یہ عورتیں، ان کفار شوہروں کے لئے حلال ہیں، اور نہ ہی وہ کفار شوہر، ان مومن عورتوں کے لئے حلال۔ اس لئے انہیں واپس کر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اُن لوگوں نے، جو کچھ ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلہ میں خرچ کیا ہو، وہ انہیں لوٹا دیا جائے۔ اس کے بعد اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم ان عورتوں سے، ان کا مہر ادا کرنے کے بعد، نکاح کر لو۔ (۲۰/۱۰)

اسی طرح تمہاری عورتوں میں سے جو اسلام نہیں لائیں، انہیں اپنے عقدِ نکاح میں مت روکے رکھو ان کے ساتھ تمہارا ازدواجی رشتہ ختم ہو گیا۔ اس معاملہ کو یوں طے کرو کہ جو کچھ تم نے ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلہ میں خرچ کیا تھا، اس کا مطالبہ کفار سے کر لو۔ اور اُن کی جو عورتیں تمہاری طرف آ گئی ہیں، ان کے سلسلہ میں جو کچھ واجب الادا ہو، وہ کفار کو دے دو۔

یہ تمہارے لئے خدا کا فیصلہ ہے ۔ اختلافی معاملات کا فیصلہ اُسی کے احکام کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اُس کے فیصلے علم اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں (اور جو فیصلے تم خود کرتے ہو ان میں تمہارے جذبات کی آمیزش کا بھی امکان ہوتا ہے)۔

(۱۱) اگر ایسا ہو کہ تم میں سے جن لوگوں کی بیویاں کفار کے ہاں رہ گئی ہیں، وہ کفار ان کے سلسلہ میں واجب الادا رقم تمہیں نہ دیں، یا اس میں سے کچھ رکھ لیں، (تو اس کا حساب رکھو)، پھر جب تمہاری باری آئے، تو جو رقم تمہارے ذمے واجب الادا ہو، اس میں سے، وہ بقایا رقم وضع کر کے ان عورتوں کے سابقہ مسلمان خاوندوں کو دے دو۔ اور اس طرح حساب صاف کر لو۔ (یاد رکھو! یہ کچھ انفرادی طور پر نہیں ہو گا بلکہ ایک اجتماعی نظام کے تابع ہو گا)۔

بہر حال، کفار کچھ ہی کیوں نہ کریں، تم ہمیشہ اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ (یہی تو ایک کافر اور مومن میں فرق ہے۔ مومن، کسی حالت میں بھی، قوانینِ خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا۔)

(۱۲) اے نبی! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں، تو تم (بہ حیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی) ان سے اطاعت کا عہد لیا کرو۔ اور وہ یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی (اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی کریں گی)۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا کی مرتکب نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی (۱۴) اور کسی پر کوئی ایسا بہتان نہیں باندھیں گی جسے انہوں نے جان بوجھ کر اپنے جی سے گھڑ لیا ہو۔ اور قانونی معاملات میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی (یعنی تیری ذاتی رائے کی پابندی ان پر لازم نہیں ہوگی، بلکہ جو احکام، تیری طرف سے، بہ حیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی، نافذ ہوں گے، ان کی اطاعت لازمی ہوگی)۔

تم ان امور کا ان سے عہد لے لیا کرو، اور پھر نظامِ خداوندی کی طرف سے ان کی حفاظت کا انتظام کرو۔ تمام افرادِ معاشرہ کی حفاظت اور نشوونما اس کے ذمے ہے۔

(۱۳) اے جماعتِ مومنین! کفار کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ہم نے اپنے احکام کی وضاحت کر دی ہے۔ لہٰذا، جو لوگ، نظامِ خداوندی سے مخالفت کی بنا پر مجرم قرار پا چکے ہیں، ان سے دوستداری کے تعلقات مت قائم کرو ــــ یہ تو عجیب بات ہوگی کہ تمہارے نظام کی نگاہ میں، وہ مغضوب اور معتوب ہوں، اور تم ان سے دوستانہ تعلقات رکھو ــــ یاد رکھو! کفر اور ایمان کا بنیادی خطِ امتیاز، خدا کا قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت کا تصور ہے۔ یہ لوگ ان بنیادی تصورات سے اسی طرح منکر ہو چکے ہیں جس طرح وہ کفار منکر ہو چکے تھے جو اسی حالت میں مرکھپ کر قبروں میں پہنچ چکے ہیں۔ دین کے بنیادی تقاضوں سے ان کا یہی انکار ہے جس کی وجہ سے، ان سے دوستداری کے تعلقات منقطع کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(جاری ہے)

کتاب بہترین دوست ہے

تمدنِ عرب یہ ضخیم کتاب تمدنِ عرب کے متعلق سب سے زیادہ مستند اور مفصل تاریخ ہے جسے ڈاکٹر گستاؤلی بان (ایک فرانسیسی محقق) کی اصل فرنچ تصنیف سے شمس العلماء سید علی بلگرامی دوم نے مع توضیحات اور حواشی اردو میں ترجمہ کیا۔ ایسی کتاب روز روز نہیں چھپا کرتی۔ اعلیٰ کاغذ پر بڑے سائز میں شائع ہوئی ہے قیمت -/۳۵ روپے۔

نزہتہ الخواطر اس میں برصغیر پاک و ہند کے ایک ہزار سال کی مدت کے اکابرِ علم اور مشاہیرِ فن کا مستند اور جامع تذکرہ ہے۔ اسے مولانا سید عبدالحئی لکھنوی نے عربی میں تالیف کیا اور ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اسکی بڑے سائز میں چار جلدیں ہیں (جلد اول۔ ۹/۰۰ روپے) (جلد دوم -/۷ روپے) (جلد سوم -/۷ روپے) (جلد چہارم ۱۳/۵۰) یہ کتاب بھی ہمارے ہاں کی نادر کتب میں سے ہے۔

فضائل صحابہؓ و اہلبیتؓ برصغیر ہند میں اصلاحِ عقائد اور احیاءِ دین کا جو عظیم الشان کام حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے شروع کیا تھا اُسے شاہ عبدالعزیزؒ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ انہی کی بصیرت افروز تصنیف ہے۔ بڑے سائز میں سفید کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے۔

مسلمان سپہ سالار اور فاتح سید محمد نصیر جامعی کی یہ تصنیف بے حد مقبول ہے۔ اس میں ۳۲ مسلمان جانباز سپہ سالاروں کے عظیم کارناموں اور فتوحات کا مفصل تذکرہ ہے۔ بڑے سائز میں۔ قیمت -/۷ روپے۔

مشہور اسلامی جنگیں سید نصیر احمد جامعی کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں جنگِ بدر سے لیکر معرکہ عین جالوت تک کے عسکری حالات کا تذکرہ ہے۔ بڑا سائز۔ قیمت ۵/۵۰ روپے

خالد بن ولیدؓ حضرت خالد بن ولیدؓ کی سوانح حیات، اردو زبان میں سید امیر احمد صاحب نے لکھی ہے بڑا سائز۔ قیمت -/۴ روپے

سرورِ کائناتؐ مشہور مصنف سید امیر علی مرحوم کی انگریزی کتاب سپرٹ آف اسلام کا اردو ترجمہ منصور احمد مرحوم نے کیا۔ کتاب اس قدر مشہور ہے کہ اسکے تعارف کی ضرورت نہیں۔ بڑا سائز۔ قیمت -/۴ روپے

عمر فاروق اعظمؓ یہ کتاب حضرت عمرؓ کی شخصیت اور کارناموں کی چہرہ کشائی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مصر کے نامور مؤرخ محمد حسین ہیکل کی عربی تصنیف کا رواں اردو ترجمہ۔ بڑے سائز میں ۶۵۷ صفحات پر مشتمل قیمت ۱۲/۵۰ روپے

ان کے علاوہ ادارۂ طلوعِ اسلام کی جملہ مطبوعات اور نامور مصنفین اور اشاعتی اداروں کی اعلیٰ پایہ کی کتابیں ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

سلسبیل

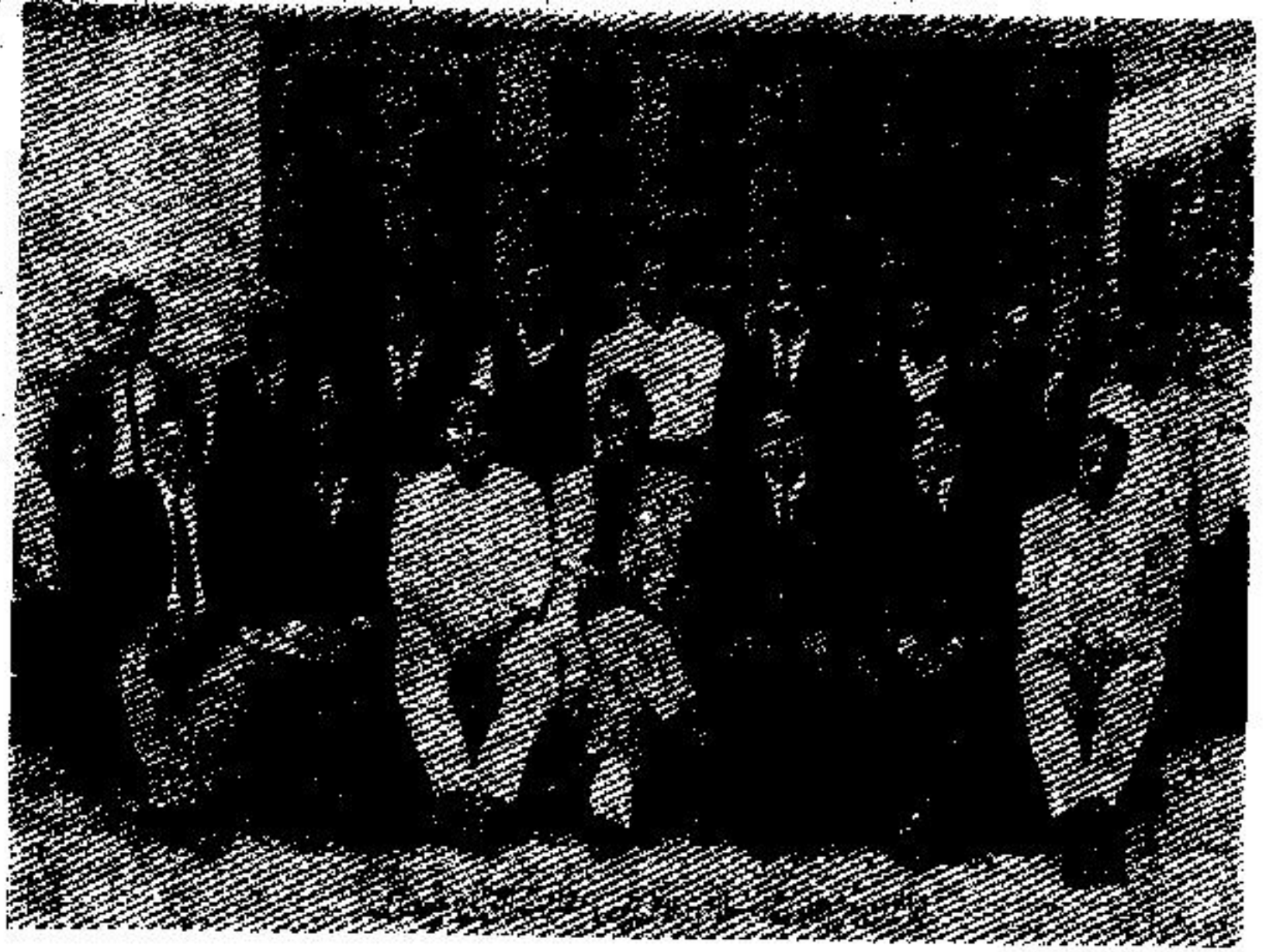

لاہور سے

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

حاصل کرنے یا منگانے کا پتہ:-

مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور